جلتا ہوا جنگل

(تین ناولٹ کا مجموعہ)

احمد یوسف

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶

جلتا ہوا جنگل

(تین ناولٹ کا مجموعہ)

جلتا ہوا جنگل

(تین ناولٹ کا مجموعہ)

احمد یوسف

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

JALTA HUA JUNGLE

(Teen Novelette ka Majmua)

by

Ahmad Yusuf

Year of Ist Edition 2008

ISBN 81-8223-361-5

Price Rs. 100/-

نام کتاب	جلتا ہوا جنگل (تین ناولٹ کا مجموعہ)
مصنف	احمد یوسف
سنِ اشاعت اوّل	۲۰۰۸ء
قیمت	۱۰۰ روپے
مطبع	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

حسن نعیم کے نام

بہ حرفِ راست نیاید پیامِ مشتاقاں
مگر تپیدنِ دل بے لب دہن گوید،

(بیدلؔ)
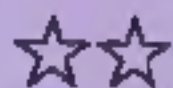
(۱) ''اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی کا مالی تعاون شامل ہے۔''

(۲) ''کتاب میں شائع مواد سے بہار اردو اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔''

(۳) ''کسی بھی قابل اعتراض مواد کی اشاعت کے لئے خود مرتب/مصنف ذمہ دار ہے۔''

ترتیب

☆☆
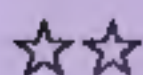
بات کچھ یوں ہے کہ......

بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ کچھ قصے تو ہر دور کے ہوتے ہیں، اور کچھ قصے ایک مخصوص دور کے ہوتے ہیں۔

جب قانون انسداد عصمت فروشی نافذ ہوا تو پیشہ ور عورتوں نے کوٹھوں سے اُتر کر محلوں میں پناہ لی۔ محلے جہاں بیشتر نچلے متوسط طبقے کے افراد، چھوٹے کارخانہ دار اور دستکار رہا کرتے تھے ان کے اخلاقی تصورات بڑے سخت تھے، چنانچہ انہیں جب اس بات کا علم ہوا کہ ان محلوں میں ایسی ویسی عورتیں آگئی ہیں تو انہوں نے بڑا شوروغل مچایا۔

ادھر زمانہ یہ تھا کہ ملک میں صنعت وحرفت کو تو پانے کا عمل شروع ہو چکا تھا اور محمد محسن صدیقی نے اس قانون کے متعلق تو یہ کہا کہ ''حکومت اس دھندے کو پرائیویٹ سیکٹر سے پبلک سیکٹر میں لے جانا چاہتی ہے۔''

دوسری طرف ڈاکٹر مجمدار اس دھندے کو پرائیویٹ تجارت کہتے ہیں۔ یوں ہر دور میں قانون ساز بھی ہوتے ہیں اور قانون شکن بھی۔

منیر ہے جو قرعہ نکالتا ہے کہ اس کا باپ کون تھا۔

اس پہ ظہیر کہتا ہے

''سید صاحب یہ خدائی خوار اپنی بے وفا ماں کی نشانی قرعہ نکالتا ہے کہ اس کا باپ کون تھا...... کمبخت سمجھ لے کہ تینوں تیرے باپ ہیں''۔

لیکن منیر کو یہ بات انتہائی گھناؤنی نظر آئی، اور اس نے احتجاج بلند کرتے ہوئے کہا

''ابا خدا کے لئے مجھے گالی نہ دو''۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ کبھی نصیر صاحب بھی ظہیر کو یہی کہا کرتے تھے۔

''یہ خدائی خوار اپنی بے وفا ماں کی اکلوتی نشانی''۔

ایک پرانے حویلی نما مکان میں کافی لوگ رہا کرتے ہیں۔ پسماندگی اور افلاس میں گھرے ہوئے یہ لوگ اپنے شب و روز بدلنے کی کوئی تدبیر نہیں کرتے۔ بس ایک جھوٹے غرور اور کجروی نے انہیں اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔

ہاں ایک بزرگ ہیں جس کے دل میں گھر کے لئے بڑا دکھ درد ہے۔ وہ معذوروں کی بیساکھی لئے گھر کے کونے کاتر کا چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ اور اس کی بہتری کے لئے نیز اس کے مکینوں کے درمیان ایک اجتماعی فکر بیدار کرنے کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں۔

لیکن کہانی والے بابا، جن کے ذہن میں سیکڑوں اور ہزاروں سال کی کہانیاں محفوظ ہیں جانتے ہیں کہ ایک بڑے سانحے اور بڑے تصادم کے بعد ہی ''وہ وقت آتا ہے''۔

یوں جب ایک مخصوص جنگل کو جو گھر کا پردہ بنا ہوا تھا، آگ لگا دی جاتی ہے تو وہ چیخ اٹھتے ہیں۔ ''عزیزو اب وقت آ گیا ہے''۔

تب ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہر دور میں قصہ ایک ہی ہوتا ہے، بس یہ کہ ہر دور میں اس کی سج دھج مختلف ہوتی ہے۔

احمد یوسف

۲۴؍ فروری ۲۰۰۵ء

☆☆

پستی کے مکیں

پچھلے دروازے سے بھاگتے وقت زلیخا سوچ رہی تھی کہ دیکھئے اب خدا کو کیا منظور ہے۔ بسا بسایا گھر، لگی لگائی تجارت۔ دونوں چیزیں اس ستم شعار نے چھین لیں۔ لیکن ستم شعار کون تھا؟ سچ پوچھو تو کوئی نہیں تھا۔ تجارت کھلے بندوں ہوتی تھی اب تجارت گلیوں اور کوچوں میں ہوگی۔ اس کا حق کون چھین سکتا ہے؟ کالے بازار کی جنس۔ اور معاً اسے اندھیرے میں روشنی کی ایک تیز لکیر دکھائی دی۔ اس پہلو پر تو اس نے کبھی غور بھی نہیں کیا تھا لیکن جیسے کسی نے چپکے سے کہا۔

''زلیخا میں کنور بلراج بہادر ہوں''۔

''آداب عرض ہے کنور جی۔ آپ تو سورگ باش ہو گئے اور آج اس ڈھتے سائے کو گھر سے بے گھر کر دیا گیا ہے۔ یہ میری بھانجیاں ہیں کنور جی۔ شبو اور مہ جبیں''۔

''یہ بچی میری بڑی بہن کی اکلوتی نشانی ہے کنور بلراج بہادر۔ آپ تو رئیس ابن رئیس ہیں آبگینوں کی قدر جانتے ہیں''۔

''آپ مجھ پر بھروسہ رکھیں زلیخا بائی''۔

کنور بلراج بہادر تمہاری ساڑھے تین سو روپے کی نوکری کچھ کم تو نہ تھی۔ جانتے ہو تم جو یہ ساڑھے تین سو روپے دیتے تھے، وہ سارے کے سارے خالہ کے پاس چلے جاتے تھے۔ میرے حصے میں تو صرف دس بیس رولیاں آتی تھیں، مگر میں نے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کی۔ کیا اچھے دن تھے۔ تم کوئی چوبیس پچیس کے ہو گے اور میری عمر کوئی سولہ سترہ سال کی

ہوگی۔ گڑیا کھیلنے والی عمر سے کچھ تجاوز کر چکی تھی۔ تم تو جانتے ہو کہ ہمارے یہاں اس دن کا بڑا شدید انتظار ہوتا ہے۔ کیسی کیسی منتیں مانگی تھیں۔ خالہ جان کو میری نتھ کی قیمت تم نے پانچ ہزار ادا کی تھی۔ تمہارے جانے کے بعد کتنے ہی خریدار آئے، کتنے ہی سودے ہوئے، لیکن سچ جانو یہ پہلا سودا دل کا تھا۔ باقی تو سب جسم کے سودے تھے، محض جسم کے۔ کنور بلراج بہادر ہم میں بھی پہلے عورت بیدار ہوتی ہے اور تب وہ مر کر طوائف کا روپ دھار لیتی ہے۔ تم کوئی نادر روزگار تو نہ تھے۔ بس عام مردوں کی سطح سے کچھ ہی بلند ہوگے اور یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی کیونکہ تمہارے خاندان میں کئی پشتوں سے امارت چلی آتی تھی۔ ہاں تو کنور بلراج بہادر تم نے بھی میرا سودا ہی کیا تھا، لیکن یقین جانو تمہارے جانے کے بعد میری زندگی میں سب خریدار ہی خریدار آئے، کوئی ایسا نہیں آیا جسے میں اپنا کہہ سکوں۔

●●●

وہ رات کتنی طوفاں خیز تھی۔ دو جسم دو روحیں۔ کنور بلراج بہادر میں نے اس رات کو ذہن کے ایک مخصوص گوشے میں مقید کر لیا ہے۔

زندگی کا یہ ایک سال۔ کیا خواب اسی عمر میں دیکھے جاتے ہیں۔ کیا یہی عمر تمناؤں اور آرزوؤں کی ہوتی ہے۔ سنو میں نے بھی ایک گھر کی تمنا کی تھی، کیونکہ اپنا گھر اپنا گھر ہوتا ہے اور اگر یہ اپنا گھر قسمت میں لکھا ہوتا تو کنور بلراج بہادر آج میں یوں بے گھر نہ ہوتی۔ لیکن ہم کیا اور ہماری تمنائیں کیا۔ تمہارے بابو، کنور دھنراج بہادر کو ایک نہ ایک دن یہ خبر ملنی ہی تھی۔ روز کا آنا بند ہوا۔ اب تم تیسرے چوتھے آتے، پھر تیسرے چوتھے دن کا آنا بھی بند ہوا۔ ہفتے ہفتے اور پھر یہ ہفتے مہینوں میں بدل گئے۔ تمہاری شادی کی بات پکی ہوگئی۔ اللہ بخشے استاد جی کو تمہاری ذرا ذرا خبریں مجھ تک پہنچ جایا کرتی تھیں۔

پھر ایک دن میں نے تمہاری برات بھی دیکھی۔ کنور بلراج بہادر سچ کہو اگر میں کوٹھے والی نہ ہوتی تو یہ برات کیا میرے گھر نہ آتی۔ لیکن ہم تو ایسی سہاگنیں ہیں جن کا دولہا کبھی باجے گاجے سے نہ آیا۔ جنہوں نے نہ کبھی مقدس اگنی کے گرد پھیرے لگائے اور نہ قاضی سے ''ہوں'' کہی۔ تو تمہاری برات دیکھ کر۔ تم نے کیا سمجھا تھا کہ میں روئی تھی۔ نہیں جی کہاں کا رونا دھونا اور کہاں کی گریہ وزاری۔ یہ چیزیں ہم لوگوں پر کہاں جچتی ہیں۔ میں نے تو صاف صاف کہا تھا کہ

ہوگا کنور بلراج بہادر اپنے گھر کا رئیس۔ میں تو اس کی نوکری کرتی تھی۔ آج سے نوکری ختم۔ وہ اپنی حویلی میں خوش میں اپنے کوٹھے میں خوش۔ لیکن تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔ یہ کہنے سے مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے پہلی بار میرے اندر ایک دوسری شخصیت کی عورت پیدا ہو رہی ہے اور جیسے میں بڑی تیزی سے بلندی سے پستی کی طرف آرہی ہوں۔ کبھی تم نے لڑھکتی چٹان دیکھی تھی؟ اور آج ہم پر قانون نے چھاپا مارا ہے۔ وہ سہاگنیں جو "پیا بن ناہیں چین" کے راگ الاپتی تھیں، اب نئے گھروں کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی ہیں۔ کیا سنگین مذاق ہے۔

ٹھیکیدار فضل کریم پانچ دس برسوں میں پانچ دس لاکھ روپے کا آدمی ہو گیا۔ یہ روپے اس نے کس طرح بنائے ہیں یہ تم نہیں جانتے، کیونکہ جب یہ نیا عہد شروع ہوا تو تم پرلوک سدھار چکے تھے۔ میں بھی نہیں جانتی۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ بھی اگر ملک وقوم کے لئے تباہ کن ہوتا تو اس کے پیچھے بھی پولس لگ جاتی۔

ایک چراغ بجھتا ہے، دوسرا جل اٹھتا ہے۔ یہی زمانے کا دستور ہے۔ تم چل بسے۔ زمینداروں کے بڑے برے دن ہیں اور اب اس نئے عہد کے نئے رئیس پیدا ہو رہے ہیں۔ ماضی کی ایک چھوٹی سی مدت، کچھ یادیں، سچ پوچھو تو یہی میرا سرمایہ ہے۔ کنور بلراج بہادر کنور بلراج بہادر۔

●●●

فضل کریم کا یہ وقت افسروں کے لئے سامان عیش بہم پہنچانے کا تھا۔ وہ انہیں سامان عیش بہم پہنچاتا تھا اور اس کے صلے میں خود بھی عیش کرتا تھا۔ اس کے لئے زندگی دراصل مچھلی کا شکار تھی۔

فضل کریم نے حیران ہو کر کہا "آتی رات گئے بن بلائے۔ میں تو خود ہی آرہا تھا"۔

"لیکن ٹھیکیدار صاحب وہاں تو بجلی گر گئی"۔ زلیخا نے اس طور پر کہا جیسے یہ مطالبہ کر رہی ہو کہ اب نئے آشیانے کی تلاش کرو۔ اور پھر جب زلیخا نے اسے اس حادثے کی تفصیل سے آگاہ کیا تو وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ "سارا معاملہ ہی گڑ بڑ ہو گیا۔ نیا انجینئر آیا ہے، میں نے شبو اور مہ جبیں کی تعریفیں کی تھیں۔ آج ہی اس نے بلایا تھا۔

"پر آج تو معاف ہی کیجئے اس بھاگ دوڑ میں بچیاں سہم سی گئی ہیں"۔

''خیر میں انجینئر کو فون کر دیتا ہوں''۔ فضل کریم نے انجینئر کو فون کر دیا۔ جواب ملا ٹھیک ہی کیا۔ پھر بھی۔

تو پھر اُٹھا وُ زلیخا اپنا برقعہ اور سنبھالو اپنی بچیوں کو۔ برقعہ اور بچیاں دو علامتیں۔

برقعہ اور بچیاں۔

فضل کریم پچپن کے لپیٹ میں آ چکا تھا۔ دس بارہ سال پہلے ایک بڑے ٹھیکیدار کے یہاں منشی تھا۔ غریب آدمی تھا۔ بڑی تنگی و ترشی میں بسر ہوتی تھی۔ لیکن کچھ ایسا کائیاں تھا کہ جب بھی کسی پیچیدہ مسئلے میں ٹھیکیدار کی گاڑی اٹک جاتی تو منشی فضل کریم اسے اپنی ذہانت سے نکال لیا کرتا۔ ہسپتال کی بڑی عمارت کا ٹھیکہ ملا ہوا تھا۔ انجینئر سے معاملہ طے نہیں ہوا تھا یا کیا بات تھی کہ اسے توڑ کر دوبارہ بنانے کا حکم ملا۔ توڑ کر دوبارہ تعمیر کرانے میں بڑا خسارہ تھا۔ ٹھیکیدار اوما شنکر کی گاڑی اٹک گئی۔ چنانچہ منشی فضل کریم بلائے گئے۔ منشی نے کہا۔ ''سرکار داؤں پیچ لگاتا ہوں۔ آپ بھی کوئی ترکیب سوچئے''۔ منشی فضل کریم نے انجینئر کے گھر کے پھیرے لگانے شروع کئے۔ انجینئر کا رسوئیا گجادھر بھولا بھالا آدمی تھا اور ایک پیالی چائے اور بنارسی پان کے دو بیڑوں پر اپنے دل کی غلاظت نکال پھینکنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ اس واقعے کے دوسرے ہی دن منشی فضل کریم صبح سویرے اوما شنکر کے پاس پہنچے۔ باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ کہنے لگا۔ ''سرکار انجینئر پر اس کی بیوی حاوی ہے اور بے طرح۔ اسے اسپنل کے ایک جوڑے کی تلاش ہے اور انجینئر اسکاچ کی ایک پیٹی پر خوش ہو جاتا ہے''۔ اوما شنکر نے اسی وقت فضل کریم کو کلکتہ کو روانہ کر دیا۔ وہ تیسرے یا چوتھے دن سارے سامان سے لیس واپس پہنچا اور یوں بگڑی بات بن گئی۔

●●●

سنتے ہیں اوما شنکر نے اس دن خوش ہو کر روایتی فرماں رواؤں کی طرح کمال دریادلی کو راہ دیتے ہوئے منشی فضل کریم سے سوال کیا۔ ''بول کیا مانگتا ہے؟''

اور منشی فضل کریم نے فریاد کی ''خداوند کچھ نہیں چاہئے، بس چھوٹے موٹے دو ایک کام عنایت فرمائیں کہ بڑی غربت میں بسر ہوتی ہے''۔ اوما شنکر کے پاس ایسے کئی ایک چھوٹے ٹھیکیدار لگے ہوئے تھے۔ سوچا پرانا آدمی ہے اور ہمیشہ برے وقتوں میں کام آیا ہے۔ فائر

بریگیڈ کی عمارت کی چاردیواری کا کام اسے سونپ دیا۔ پیسے میرے منافع تمہارا۔

چنانچہ منشی فضل کریم نے جو کل تک منشی تھا اور آج ٹھیکیدار ہو گیا تھا، جب اس پہلے ٹھیکے میں تین ہزار روپے کمائے تو گھر آ کر اس کے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ کاش وہ روپے اتنی ہی تیزی سے بڑھتے جتنی تیزی سے ان کی بیٹی سلمیٰ بڑھتی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا تھا کہ یہ پانچ دس برسوں میں پانچ دس لاکھ روپے کی کہانی محض حرص و ہوس کی کہانی تھی۔

ویسے ٹھیکیدار فضل کریم بڑا بھلا آدمی تھا۔

''لیکن ارادے کدھر کے ہیں ٹھیکیدار صاحب''۔

وہی اپنا پرانا غمخوار عظیم الدین۔ اس گھڑی تو وہی کام آئے گا۔ فضل کریم چھوٹے چھوٹے جملوں میں بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ اب اس کے سامنے زلیخا، شبو اور مہ جبیں کا مسئلہ تھا۔ ابھی تک اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا تھا کہ پولس کا یہ جملہ اس کے حق میں برا ہوا یا اچھا ہوا۔ فضل کریم کی سوجھ بوجھ سے کسے انکار تھا۔ لیکن کبھی کبھی کوئی مسئلہ اس طرح راہ میں اچانک حائل ہو جاتا ہے کہ اس جیسا آزمودہ کار بھی . .

''مسئلے کی نوعیت یہ ہے کہ خان بہادر عظیم الدین۔ اچھا تم پہلے ستر (۷۰) کی بوتل سنبھالو۔ اور عظیم الدین نے جو 'خان بہادر' کی ترکیب کے ساتھ کچھ کریلا اور نیم چڑھا قسم کی چیز ہو جاتا تھا، ایک نعرۂ تحسین بلند کرتے ہوئے کہا ''جیو جیو میرے راجہ۔ خدا تم پر اپنا فضل قائم رکھے۔ بگڑی بن جاتی ہے جب فضل خدا ہوتا ہے''۔ اور اس نے کانا پھوسی کے انداز میں زلیخا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''مگر ٹھیکیدار صاحب ان بھری بوتلوں کے ساتھ یہ خالی بوتل کیوں اٹھا لائے۔'' فضل کریم نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا ''ہوش کی دوا کرو خان بہادر، یہی تو دراصل بھری بوتل ہے''۔ اور اس جملے میں جو رمز پوشیدہ تھا اسے عظیم الدین نے بوتل کی کارک اڑاتے ہوئے کہا ''ہو گی ہو گی بھائی، مجھے کیا پتہ تھا کہ تم آج کل فلسفی بھی ہو گئے ہو''۔

●●●

ہاں تو خان بہادر میں کچھ مسئلے کی نوعیت کے متعلق عرض کر رہا تھا .. شاید۔ تو یوں سمجھو کہ وہ قانون جو عصمت فروشی کی روک تھام کے لئے پاس ہوا تھا، وہ ہماری سرکار عالیہ کے

خیال میں ٹھیک طور پر نافذ نہیں ہو پا رہا تھا اور آج پولس نے کئی کوٹھوں پر چھاپے مار کر گویا اس قصے ہی کا خاتمہ کر دیا"۔

خان بہادر عظیم الدین نے ستر کے دو گھونٹ حلق سے اُتارتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں ہے، کوئی بات نہیں ہے، دل میں جگہ ہونی چاہئے۔ دنیا کب تنگ ہے، میرا گھر تمہارا گھر ہے۔ میرا گھر ان کا گھر ہے۔ اس گھر میں تین کمرے ہیں، غسلخانہ ہے، پاخانہ ہے اور وہ کونے میں چوہا بنا ہے جو ادھر برسوں سے روشن نہیں کیا گیا ہے۔ میں تو ہمیشہ کا رنڈوا ہوں زلیخا بائی"۔

وہ کچھ دیر اسی طرح بے تکی ہانکتا رہا اور جب وہ چپ ہوا تو ستر کی بوتل بولنے لگی۔

فضل کریم نے رخصت ہوتے ہوئے کہا "اچھا بیگم اس وقت تو یہیں آرام کرو۔ کل کوئی اور منصوبہ بنایا جائے گا۔ زلیخا کے لئے وہ اکثر "بیگم" کا استعمال کیا کرتا تھا اور ہر بار زلیخا نے یہ محسوس کیا تھا جیسے وہ تاش کی بیگم بن گئی ہو۔

تو اس رات عظیم الدین کے لئے وہ آتش سیال دو آتشہ اور سہ آتشہ بن گئی۔

دوسرے دن فضل کریم سویرے ہی سویرے آ پہنچا۔ عظیم الدین جمائیں لیتے ہوئے اٹھا۔ گنجے سر پر دو تین بار ہاتھ پھیر کر اس نے یہ یقین کر لیا کہ رات کا خمار ٹوٹ چکا ہے اور سر اپنی جگہ پر قائم ہے۔ فضل کریم نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا حال ہے خان بہادر"۔ اور خان بہادر کی شکر گزار آنکھوں نے جواب دیا۔

"شکریہ یار فضل کریم تم نے تو دوستی کا حق ادا کر دیا۔ اسی طرح کبھی کبھار ایک آدھ ٹھیکہ مجھے بھی دیتے رہو تو یہ تھوڑی سی بچی کھچی زندگی بھی مزے میں گزر جائے گی۔

"تم تو بڑے جہانیاں جہاں گشت بنے پھرتے ہو خان بہادر۔ یہ بتاؤ تمہاری نظر میں کوئی ایسا مکان ہے جسے خریدا جا سکے"۔

عظیم الدین سوچنے کے انداز میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں فضل کریم نے دزدیدہ نگاہوں سے زلیخا کی پاس بک دیکھ لی، جس میں کوئی پندرہ ہزار روپے کی رقم درج تھی۔

عظیم الدین نے چونک کر کہا۔ "تو پھر چلو"۔

اور جب وہ لوگ سڑک پر آ گئے تو عظیم الدین نے فضل کریم کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتے ہوئے کہا "یار فضل کریم یہ کونسا پتہ پھینکا ہے تم نے"۔

فضل کریم نے ہنستے ہوئے کہا ''خان بہادر اپنے پاس تو سبھی ترپ کے پتے ہیں، کوئی سات آٹھ ہزار میں مکان خریدو اور بارہ تیرہ ہزار کی رجسٹری کراؤ۔ کچھ نہ کچھ تو اس ہیر پھیر میں ملنا ہی چاہئے۔ زیادہ رقم سے زلیخا بھانپ جائے گی۔ آخر تو رنڈی ذات ٹھہری اس کے تجربوں سے کون انکار کرسکتا ہے۔ اور میں تو ایک بڑی دور کی اسکیم کے متعلق سوچ رہا ہوں''۔ اور جب خان بہادر نے اسکیم کے متعلق دریافت کیا تو فضل کریم نے جواب دیا ''صبر کرو اور دیکھتے جاؤ''۔

عظیم الدین نے کئی ایک مکان دکھائے۔ ان میں بیشتر مکان کچے تھے، کچھ پکے بھی تھے، مگر ان میں بجلی اور پانی کا انتظام نہیں تھا۔ گلی کوچوں کے یہ مکان فضل کریم کو قطعی پسند نہیں آئے۔ فضل کریم کی یہ خواہش تھی کہ مکان میں بجلی پانی کا انتظام ہونا چاہئے۔ دوسری بات جسے وہ بے حد اہم سمجھتا ہے وہ یہ تھی کہ مکان کو ایسی جگہ ہونا چاہئے جہاں آنے جانے والوں کو دقت نہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ برسات میں محض خراب راستوں کی وجہ سے کام رک جائے۔ عظیم الدین گو مکانوں کی دلالی کرتا تھا، مگر اس میں اتنی تاجرانہ سوجھ بوجھ کہاں۔ کئی گھنٹوں کی دوڑ دھوپ کے بعد جب فضل کریم نے اسے یہ راز کی بات بتائی تو عظیم الدین کے چہرے پر ایک ہلکی سی ناخوشگوار لہر دوڑ گئی۔ ''تو ٹھیکیدار صاحب پہلے ہی یہ بتا دیا ہوتا''۔

''یہ تو تمہیں خود ہی سمجھنا چاہئے تھا، آخر طوائفیں ہیں، چکی چلانے سے رہیں''۔

ننھے نواب کی ڈیوڑھی کھلی تھی اور وہ ایک چھوٹی سی کھری چارپائی پر بیٹھے دعائے گنج العرش پڑھ رہے تھے۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی کھڑے ہوگئے اور مزاج پرسی کے بعد انہوں نے ٹھیکیدار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کہئے ٹھیکیدار صاحب کیسے کیسے زحمت کی آپ نے''۔

ننھے نواب اوما شنکر کے اسکول کے ساتھی تھے، اس لئے فضل کریم ہمیشہ سے ان کا لحاظ کرتا آیا تھا۔ برسوں پہلے اوما شنکر کے یہاں روز کی نشست تھی۔ لیکن بالآخر ہوا یہ کہ اوما شنکر پچاسوں لاکھ کا آدمی ہوگیا اور ننھے نواب اپنی ڈیوڑھی میں بیٹھے دعائے گنج العرش پڑھتے رہ گئے۔

''میں تو وہی منشی فضل کریم ہوں ننھے نواب صاحب۔ مزدور ہوں دن بھر کی عرق ریزی کے بعد بال بچوں کے لئے دو وقت کی روٹی مہیا کرلیتا ہوں''۔

ننھے نواب نے دل میں سوچا۔ لاکھوں کا آدمی ہو گیا لیکن طبیعت میں وہی انکسار باقی ہے، ایسوں ہی کو خدا دیتا ہے۔

"تو پھر فرمائیے"۔ اور معاً ننھے نواب کو کچھ یاد آ گیا اور انہوں نے زنانخانے کے دروازے کی طرف گردن بڑھا کر کہا۔ "سعیدن پان لیتی آنا"۔

"تکلف کی چنداں ضرورت نہیں ہے ہم لوگ ایک خاص غرض سے آئے ہیں"۔

"ظاہر ہے، ظاہر ہے۔"

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ ٹاٹ کے جھولتے ہوئے پردے کے پیچھے سے پان کی ایک طشتری بڑھی۔ ننھے نواب نے طشتری لے کر فضل کریم کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تو ارشاد"۔ عظیم الدین نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا "آپ نے ایک بار وہ میرن کی گلی والے مکان کا ذکر کیا تھا"۔

"جی ہاں جی ہاں میں نے آپ سے ذکر کیا تھا"۔

بات یہ ہے جناب عالی کہ میری حالت تو آپ لوگوں سے کچھ چھپی نہیں ہے، اور میری بھی کیا، آپ جیسے لوگ جو وقت کی نبض پہچانتے ہیں، ہر شخص کے اندرونی حال سے بخوبی واقف ہوں گے۔ میں نے اندرونی حال یوں کہا کہ بظاہر تو یہ خاکسار ننھے نواب کسی نہ کسی طرح سفید پوشی نبھائے جا رہا ہے، لیکن اس کے لئے کیا کیا جتن کرنے پڑ رہے ہیں یہ کچھ دل ہی جانتا ہے۔ بس اللہ ہی عزت بچائے تو بچیئے۔ آپ لوگ گھر کے آدمی ہیں اس لئے کہہ رہا ہوں، خون کا رشتہ نہ سہی پڑوس کا رشتہ ہی کیا کم ہوتا ہے۔ تو عرض یہ ہے کہ تین لڑکیاں تو خدا کے فضل سے بیاہی جا چکی ہیں، بس ایک لڑکی کا مسئلہ میرے لئے جان لیوا ہو گیا ہے۔ لڑکے والوں کے وہ مزاج ہیں کہ خدا کی پناہ۔ مختلف مدارج ہیں لڑکوں کے۔ آپ لوگ تو بخوبی واقف ہوں گے۔ ایک صاحب جو لڑکوں کی فہرست لئے پھرتے ہیں، ابھی کوئی مہینے بھر پہلے یہاں آئے تھے۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ کتنا دینا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا بھائی تین چار ہزار یا کھینچ تان کر پانچ ہزار دے دوں تو دے دوں ورنہ اس سے زیادہ کی میری اوقات نہیں ہے۔ کہنے لگے اتنے روپیوں میں تو میٹرک پاس لڑکوں کا ملنا بھی مشکل ہے۔ عبدالباری صاحب میرے ایک دوست ہیں۔ آپ تو ٹھیکیدار صاحب انہیں جانتے ہوں گے۔ ابھی کچھ دن پہلے یہاں

آئے تھے۔ ضمناً لڑکی کی شادی کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگے بھائی میرا بھی ایک لڑکا ہے۔ میں تو لینے دینے کو سخت معیوب سمجھتا ہوں لیکن تمہاری بھابھی کی خواہش ہے کہ پانچ ہزار میں یہ سودا طے کیا جائے۔ یہ گویا صریحاً اشارہ تھا کہ اگر پانچ ہزار دیتے ہو تو مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔ کیا زمانہ آ گیا ہے غیر تو غیر اپنے بھی بدل گئے۔ مگر کیا کیا جائے حالات جھکنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جوان جہان لڑکی کو کوئی کب تک بیٹھائے رکھے گا۔ لڑکا خاصا ہے۔ دامودر ویلی پروجیکٹ میں جانے کیا کرتا ہے۔ سنتے ہیں دو سو روپے کے قریب تنخواہ ملتی ہے۔ چنانچہ باری صاحب کی بیگم لڑکی کو دیکھنے آئی تھیں۔ لڑکی انہیں بے حد پسند آئی۔ یوں بچپن میں وہ دیکھ بھی چکی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کرایا کہ تاریخ مقرر کرنے کب تک آئیں۔ میں نے کہا ایک آدھ مہینہ ٹھہر جائیے، پھر انشاء اللہ آپ کو خبر کروں گا۔ ویسے شریفوں میں زبان کی بڑی زبردست پکڑ ہوتی ہے۔ انہوں نے کہلوا بھیجا کہ انشاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔ ایک وہ دن تھے کہ ننھے نواب کے خاندان میں شادی کرنا باعث صد افتخار سمجھا جاتا تھا، اور اب یہ حال ہے کہ ننھے نواب کو پانچ ہزار کی رقم دے کر لڑکی کے لئے گویا مرد خریدنا پڑ رہا ہے۔

ع ہمیشہ رہے نام اللہ کا

تو عرض یہ ہے ٹھیکیدار صاحب میں واقعی اس مکان کو الگ کرنا چاہتا ہوں"۔ ٹھیکیدار نے دل میں سوچا یہ اگلے وقتوں کے رئیسوں کے یہاں "الگ" کرنے کی اصطلاح خوب چلتی ہے۔

"اور میں نے اس سلسلے میں عظیم الدین صاحب سے بھی ذکر کیا تھا"۔ انہوں نے عظیم الدین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

"جی ہاں مجھے خبر ملی تھی۔ ویسے آپ نے قیمت کیا رکھی ہے"۔

"کوئی سات ساڑھے سات ہزار کے قریب قیمت لگی ہے، مگر میں اپنوں ہی کو دینا چاہتا ہوں۔ آپ مطلب سمجھ گئے ہوں گے"۔

فضل کریم نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو نواب صاحب میں جلد ہی کہلوا بھیجوں گا جب تک آپ کسی اور سے بات نہ کریں"۔

ننھے نواب سے اجازت لے کر جب وہ لوگ باہر نکلے تو فضل کریم ایک اطمینان کی

سانس لیتے ہوئے بولا۔ "ننھے نواب اپنا ہی دکھڑا لے بیٹھے۔ کیا برے دن آگئے ہیں ان لوگوں کے"۔ اور یکایک خان بہادر نے سترکی بوتل سے باہر نکل کر کہا "تم کٹرہ قادر بخش میں بسے ہوئے سابق زمیندار گھرانوں سے مل آؤ، تمہیں سچ کہتا ہوں میر کی مثنوی شہر آشوب کا مزا آ جائے گا"۔

فضل کریم نے داد دیتے ہوئے کہا "کیا بات پیدا کی ہے خان بہادر۔ دراصل زندگی میدان کارزار ہے اور یہاں وہی کامیاب ہوتا ہے جو وقت کے رخ پہچانتا ہو۔"

عظیم الدین نے سوچا۔ "مگر منشی فضل کریم نے تو کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی۔"

زلیخا کی تیوری پر کئی ایک بل پڑے تھے۔ معلوم ہوا کہ شبو نے دال میں نمک کم ڈالا تھا۔ "پہاڑ جیسی ہو گئی، لیکن ایک ذرا دال بنانا بھی نہیں آیا۔ میں تو عاجز ہوں اس لڑکی سے"۔ شبو اس جملے پر ابل سی گئی "تو پھر مجھے گھر جانے دو۔ میری اندھی ماں نے جانے کیا کیا خواب دیکھے تھے۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

زلیخا نے بگڑے حالات کا اندازہ کرتے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا اور پیار سے بولی "میں تو تیرے بھلے کے لئے کہتی ہوں بیٹی، کون جانتا تھا کہ ہم جو کوٹھوں پر راج کرتے تھے، باورچی، خدمت گار، ... کیں، سبھی تو تھے ہمارے یہاں، اس طرح گلی کوچوں میں ٹھوکریں کھاتے پھریں گے۔ بیچارے ٹھیکیدار صاحب دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ کوئی نہ کوئی ڈھنگ کا مکان مل ہی جائے گا، اور ہمارے دن لوٹ آئیں گے"۔ اور شبو کو ایسا محسوس ہوا جیسے زلیخا کے پہلو میں ماں جاگ پڑی ہو۔

عظیم الدین نے سمجھتے ہوئے طوفان کا اندازہ کر لیا تو دھیمے سروں میں بولا "میرے [illegible] زلیخا بائی"۔

اور جب آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی شبو کھانا لے کر آئی تو عظیم الدین نے اپنا [illegible] شروع کیا۔ "ابھی مست ہوں [illegible]"۔

مہ جبیں اس واقعے سے دل ہی دل میں خوش تھی۔ مہ جبیں زلیخا کی خالہ حمیدہ کی نواسی تھی۔ ماں اس کی پیدائش کے بعد ہی مر گئی تھی۔ نانی نے پرورش کی تھی اور بڑے ناز نخرے میں رکھا تھا۔ اپنی زندگی ہی میں دس ہزار روپے زلیخا اور مہ جبیں کو برابر برابر بانٹ دیے تھے۔ مہ

جبیں کی عمر اس وقت کوئی بارہ سال کی ہوگی۔ چنانچہ یہ پوری رقم زلیخا ہی کے نام سے بینک میں جمع کرائی گئی۔ نانی اسی سال چل بسی اور اب ادھر آٹھ سال سے مہ جبیں زلیخا کی تحویل میں تھی۔ اب اس کی عمر کوئی بیس سال کی تھی۔ سولہ ہی سال کی عمر میں پوری پیشہ ور بن چکی تھی، لیکن شبو نے بالکل ہی مختلف ماحول میں پرورش پائی تھی۔ زیادہ نہیں کوئی دو ڈھائی سال پہلے ہی کی تو بات ہے کہ زلیخا اور مہ جبیں مظفر پور، رائے بہادر دوار کا پرشاد کے یہاں ایک تقریب میں بلائی گئی تھی۔ رائے بہادر کا علاقے میں بڑا نام تھا۔ کہا جاتا تھا کہ شہر میں پرانے رسم و رواج اور پرانی تہذیب کی ایک آخر شمع رائے بہادر کی شکل میں جھلملا رہی ہے، جانے وہ بھی کب بجھ جائے۔ چنانچہ اس یادگار زمانہ نے پوتے کی شادی میں خاندان بھر کو یہ کہلا بھیجا کہ یہ میری زندگی کی آخری تقریب ہے، اس لئے میں اسے حوصلوں اور ارمانوں کے ساتھ انجام دینا چاہتا ہوں (ان دنوں شہر میں یہ عام چرچا تھا کہ 'بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے')۔ رنڈیوں کے کئی کئی طائفے لکھنؤ، بنارس، پٹنہ اور جانے کہاں کہاں سے بلائے گئے تھے۔ وہیں یہ دبلی پتلی نازک سی لڑکی اسے ملی تھی۔ شادی کی سج دھج دیکھنے آئی تھی، اسے کیا پتہ تھا کہ وہاں پہنچ کر اسے اپنی سج دھج بھی اسی تقریب کی نذر کرنی پڑے گی۔ یہ لڑکی زلیخا کی نظروں میں کھب سی گئی۔ رائے بہادر کے منجھلے لڑکے بابو کامتا پرشاد اکثر اس کے یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ خلوت میں ملاقات ہوئی تو زلیخا نے پوچھ ہی لیا کہ وہ گلبدن کون تھی سرکار اور بابو کامتا پرشاد نے اس کی آنکھوں کی تجسس کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا۔

''پڑوس میں ایک مولوی سبحان تھے، بڑے غریب اور نیک آدمی تھے، انہی کی پتری ہے''۔

''لے جانا چاہو تو لے جاؤ تمہارے یہاں نام پیدا کرے گی۔'' بابو کامتا پرشاد کے لبوں پر طنز آمیز مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔

مولوی سبحان کی بیوہ کی بینائی کب کی جا چکی تھی اور یہ نازک سی لڑکی جسے پہاڑ سا قد نکلا تھا اس کی چھاتی پر بیٹھی مونگ دل رہی تھی۔ زلیخا اتہ پتہ پوچھ کر وہاں پہنچی اور جانے کیا کیا دم دلاسے دئے۔ ''میں بھی پیٹھان ہوں تم بھی پیٹھانی ہو. . .''۔ بڑھیا جھانسے میں آگئی اور کہنے لگی ''تو لے جاؤ لیکن شادی کے بعد اسے اس کے دولہا کے ساتھ کم از کم ایک بار ضرور بھیج

دینا''۔ شبو زلیخا کے کوٹھے پر پہنچ کر کچھ انجانی سی بو باس محسوس کرتی رہی۔ پھر بھی اس نے کئی راتیں خوابوں کے شیش محل میں شہزادہ گلفام کے ساتھ بسر کیں۔ لیکن ایک رات ایک بدمست سانڈ نے اس شیش محل کو اپنے پیروں تلے روند دیا۔ اور پھر شہزادہ گلفام کبھی نہیں آیا، کبھی نہیں آیا۔ اس کی جگہ ٹھوس حقیقتوں نے چھین لی۔

خون خون کی بات ہوتی ہے ٹھیکیدار صاحب۔ دیکھئے اسی دن کی بات ہے میں نے شبو کو سخت سست کہہ دیا تھا، بس دو چار آنسو بہا کر چپ ہو گئی اور یہ ایک اپنی مہ جبیں ہے، میں نے بس ذرا کہا کہ اس مفت خور سے عظیم الدین کو زیادہ منھ نہ لگایا کر تو چڑھ کر لڑنے کو تیار ہو گئی۔ جانے وہ موا کیا چاہتا ہے۔ مجھے تو خدشہ ہے کہ کہیں کسی دن یہ لونڈیا اس مال زادے کے ساتھ بھاگ نہ جائے''۔

عظیم الدین کسی مکان کا سودا کرانے رجسٹری آفس گیا ہوا تھا۔ شبو اور مہ جبیں کوٹھری میں لیٹی جاسوسی ناول پڑھ رہی تھی۔

''میں تو یہ بات کئی دنوں سے کہنا چاہتی تھی، پر آپ جب جب آئے وہ بھی یہیں موجود رہا''۔ اور فضل کریم نے اس آنچ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا'' تم نے غلط اندازہ لگایا۔ عظیم الدین دل کا بہت اچھا ہے، میرے بچپن کا لنگوٹیا یار ہے۔ تم خواہ مخواہ اس سے خائف ہو۔ پھر بھی میں جلد ہی مکان خریدنے کی کوشش کرتا ہوں''۔

ننھے نواب سے سودا سات ہزار روپے میں طے ہو گیا۔ ایک ہزار روپے بطور پیشگی دے دیئے گئے۔ ٹھیکیدار نے ننھے نواب کو اس بات پر تیار کر لیا کہ رجسٹری کے وقت کل قیمت بارہ ہزار روپے لکھی جائے گی۔ ''انکم ٹیکس کے حساب میں خرچ کچھ زیادہ ہی دکھانا چاہئے''۔ اور اس بات پر ننھے نواب کو اطمینان ہو گیا۔ ''مکان آپ کو خالی ہی ملے گا ٹھیکیدار صاحب، آپ چاہیں تو کرائے پر اٹھا سکتے ہیں''۔ ننھے نواب نے کارروائی ختم ہونے پر کہا

''لیکن مکان تو میں نے اپنی نئی بیگم کے لئے خریدا ہے''۔

''نئی بیگم''۔ ننھے نواب سوالیہ نشان بن گئے۔

جی ہاں دینا ناتھ کے کوچے میں ایک بڑی بی اور ان کی بیوہ لڑکی رہتی تھی۔ بڑی بی میرے یہاں اکثر آیا کرتی تھیں اور ہمیشہ اپنی بیوہ لڑکی کی قسمت کا رونا رویا کرتی تھیں۔ مجھ

سے ان کا یہ دکھ دیکھا نہیں گیا۔ چنانچہ پچھلے مہینے میں نے ان کی لڑکی سے نکاح پڑھالیا۔
ننھے نواب اس ایثار سے کافی متاثر ہوئے "خدا آپ کو اس کا اجر دے گا ٹھیکیدار صاحب"۔ اور ٹھیکیدار جس کے سینے میں خدمت خلق کا جذبہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا، ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔ "میرے دل میں تو بڑے عزائم ہیں، دعا کیجئے خدا انہیں پورا کرے"۔
اب ارادے یہ ہیں خان بہادر . . اور پھر انہوں نے تبدیل شدہ حالات پر تبادلۂ خیال کیا۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ زلیخا کا پاندان کھلا تھا اور وہ پان بنانے میں منہمک تھی۔
"بیگم ایک اچھا سا پان کھلاؤ"۔
"کیا رجسٹری ہو گئی؟"
"پیشگی دے دی گئی ہے۔ ہفتے دس دن میں مکان مالک کوئی اور مکان ڈھونڈ لے گا تو ہم لوگ رجسٹری کرالیں گے۔ بس سمجھو مکان ہو ہی گیا"۔
"لیکن غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ تم وہاں رہو گی کس طرح"۔
"کیوں، جس طرح کوٹھے پر رہتے آئے تھے"۔
"وہ میرن کی گلی ہے زلیخا، تمہارا ٹھٹھیری بازار نہیں ہے، ذرا سوچ لو اچھی طرح"۔ اور عظیم الدین نے اشارہ پا کر کہا۔
"میری تو رائے ہے ٹھیکہ دار کہ تم زلیخا بائی سے نکاح پڑھالو"۔
ایک ثانئے کے لئے زلیخا کو ایسا محسوس ہوا جیسے کنور بلراج بہادر ایک بار پھر اس کی زندگی میں گھس آیا ہو اور تیئیس (۲۳) سال پہلے کی وہ رات جو اس کے ذہن میں مقید تھی اچانک باہر نکل کر بولی۔
"زلیخا بائی میں اب واپس نہیں آسکتی ہوں، میں اب واپس نہیں آسکتی ہوں"۔ اور زلیخا نے تیز ہو کر کہا۔ "یہ کیا مذاق ہے خان بہادر، اس عمر میں یہ چونچلے اچھے لگتے ہیں"۔
"لیکن مصلحت کیا کچھ نہیں کرادیتی"۔ فضل کریم نے کامل سنجیدگی کو راہ دیتے ہوئے کہا۔ "تم اگر ٹھٹھیری بازار کی جنس بن کر میرن کی گلی میں رہنا چاہو تو شاید ایک پل بھی ٹکنا مشکل ہے، لیکن فضل کریم کی منکوحہ ہر جگہ رہ سکتی ہے، سماج میں اس کے لئے کوئی بندش نہیں ہے"۔
زلیخا جیسے کھوسی گئی اور جب اسے یہ احساس ہوا کہ ٹھیکیدار فضل کریم اور خان بہادر عظیم الدین دیر

سے جواب کے منتظر ہیں تو وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی۔ ''لیکن شبو اور مہ جبیں کیا کہیں گی''۔

ایک ہنگامی جلسے میں خان بہادر عظیم الدین اور ٹھیکیدار فضل کریم نے موقعہ کی نزاکت پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ اگر ہمیں میرن کی گلی میں باعزت طور پر رہنا ہے تو یہ نکاح وقت کا ایک اہم تقاضہ ہے۔ حاضرین جلسہ نے ہامی بھری اور یہ تجویز کثرت رائے سے منظور کی گئی۔ یہ جلسہ گھر کے پانچ افراد پر مشتمل تھا۔

اور اس رات مولوی واعظ الحق نے خان بہادر کے گھر پر زلیخا بائی کا نکاح فضل کریم ولد عنایت کریم سے پڑھا دیا۔

گھر کی رجسٹری ہو چکی تو یہ طے پایا کہ دو ایک دن بعد نئے گھر میں جا بسیں گے۔ سامان درست کیا جانے لگا۔ زلیخا کے پاس تو برقعہ تھا، لیکن شبو اور مہ جبیں کے پاس برقعے نہیں تھے۔ چنانچہ ان کے لئے نئے برقعے سلوائے گئے کہ میرن کی گلی میں انہیں عزت دار لڑکیوں کی طرح زلیخا زوجہ ٹھیکیدار فضل کریم کی یتیم بھانجیاں بن کر رہنا تھا۔ گویا انہیں شیشے کی الماریوں سے نکال کر خوبصورت ڈبوں میں بند کیا جا رہا تھا۔

شام ڈھلے محسن صدیقی کی بیٹھک میں جمگھٹا سا لگ جاتا۔ محسن صدیقی کسی سرکاری دفتر میں بڑا بابو تھا، لیکن کچھ ایسا یار باش اور قلندر سے مزاج کا آدمی تھا کہ اچھا خاصا گھر کامن روم بن کر رہ گیا تھا۔ کیا نہیں تھا محسن صدیقی کے گھر میں کیرم، تاش، شطرنج، لوڈو، ڈرافٹ اور پھر ایک بہت ہی عظیم دل جو محسن صدیقی کے سینے میں رہنے کے باوجود دوستوں کے قبضے میں رہا کرتا تھا اور جس کا ۱۰۱ واں حصہ بھی اس کی بیوی اور گھر والوں کی دسترس سے باہر تھا۔ ویسے محسن صدیقی اپنی ماں کا فرمانبردار بیٹا، اپنے بھائی بہنوں کا چہیتا بھائی، اپنی بیوی کا مہربان شوہر اور اپنے بچوں کا شفیق باپ بھی تھا، لیکن گھر میں داخل ہوتے ہی بیٹھک کی دنیا جیسے بول اٹھتی۔ ''محسن صدیقی تم تو صرف میرے محسن ہو، اندر جاؤ مگر جلد ہی لوٹ آنا''۔ شاید اس باہر کی دنیا اور گھر کی دنیا کو بقائے باہم کے اصول پر چلانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی تھی۔

محسن صدیقی منہ ہاتھ دھو کر دو گھڑی کے لئے گھر والوں کے درمیان بیٹھ جاتا۔ وہ سارے گھر کی تمناؤں اور امیدوں کا مرکز تھا۔ کھانا کھانے کے بعد چائے کے وقفے میں وہ بیوی سے سارے دن کی رپورٹ لے لیتا، لیکن چائے ختم ہوتے ہی وہ بیٹھک کا رخ کرتا خواہ

اس درمیان وہ رپورٹ ختم ہوئی ہو یا نہ ہو۔ باہر کی دنیا گیارہ ساڑھے گیارہ بجے رات کو اپنی بوجھل آنکھیں لئے رخصت ہوتی۔ بے خواب کواڑ بند کر دیے جاتے اور جب محسن صدیقی اس لالٹین کو اٹھائے جو ہر روز چار پانچ گھنٹے یاروں کے تصرف میں رہا کرتی تھی، اپنے سونے کے کمرے میں پہنچتا تو بیوی کو محوِ انتظار پاتا۔ وہ دھیمے لہجے میں کہتی۔ ''آ گئے آپ''۔

اس ایک جملے میں کوئی شکوہ نہیں ہوتا کوئی گلہ نہیں ہوتا، کیونکہ یہ سارے معمولات ان روایتوں کا ایک حصہ تھے جو اسے ورثے میں ملی تھیں۔ روایتوں کا صرف احترام کیا جاتا تھا، انہیں بنانے سنوارنے اور آگے بڑھانے کا سوال ہی کہاں اٹھتا تھا۔

اس رات بھی محسن صدیقی اور محمد احمد خاں شطرنج کھیل رہے تھے۔ محمد احمد خاں خورجہ کے رہنے والے تھے۔ خورجہ کے اچار بیچتے بیچتے جانے کس طرح میرن کی گلی تک پہنچ گئے۔ زبان میں لذت آگیں ترشی تھی۔ انہیں یہاں آئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا، لیکن حیرت اس پر ہوتی تھی کہ اوروں کی طرح انہوں نے بھی محسن صدیقی کے دل کے ایک حصے پر قبضہ جما لیا تھا (دروغ برگردن راوی۔ سنتے ہیں کہ ایک دن بھری مجلس میں بچپن کے کسی دوست نے کہہ دیا تھا کہ بیچارے محسن صدیقی کا دل نہ ہوا یتیم کا مال ہو گیا)۔

محمد احمد خان کے سبھی اہم مہرے پٹ چکے تھے۔ بس کسی نہ کسی طرح شاہ کی عزت بچائے لئے جا رہا تھا کہ اتنے ہی میں ایک زوردار ''السلام علیکم'' نے پوری مجلس کو چونکا دیا۔ یہ ٹھیکیدار فضل کریم تھا جس کی نئی نویلی بیگم اس شام کو محسن صدیقی کی قریب ترین پڑوسی بن چکی تھی۔

مزاج پرسی کے بعد ٹھیکیدار فضل کریم نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ دروازے سے لگی لالٹین تلے کچھ لوگ کیرم کھیل رہے تھے، کچھ تاش کھیل رہے تھے اور ان سبھوں سے الگ تھلگ شطرنج کی بساط بچھی تھی، جس پر خورجہ کے محمد احمد خاں اور محسن صدیقی نئے نئے نقشے بنا رہے تھے۔ ٹھیکیدار فضل کریم نے سوچا یہ لوگ جو دنیا کی بساط پر ایک معمولی پیادے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، ان کے ہاتھ میں شاہ، وزیر، گھوڑے، فیل، رخ۔ غرض کہ پوری ایک فوج کی کمان سونپ دی جاتی ہے، عجیب بات ہے۔

محسن صدیقی کو پاسنگ شو کی پوری ایک سگریٹ کا افسوس تھا، کیونکہ جیسے ہی وہ روشن کی

گئی تھی، فضل کریم آدھمکا تھا۔ محسن صدیقی نے جس معاشرے میں آنکھیں کھولی تھیں اس میں بزرگوں کے سامنے سگریٹ پینا خلاف تہذیب تصور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ وہ سگریٹ کو سسکتا چھوڑ کر فضل کریم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جو غالباً گفتگو کے لئے مناسب الفاظ کی تلاش میں سرگرداں تھا۔

''کہئے چچا صاحب کیسے زحمت کی آپ نے''

''قصہ یہ ہے عزیزم کے تمہارے مکان سے ملا ہوا وہ جو ننھے نواب والا مکان ہے اُسے میں نے خرید لیا ہے۔ غالباً تمہیں معلوم ہوا ہوگا''۔ ''جی ہاں خبر ملی تھی''۔

''اور آج شام تمہاری چچی اس مکان میں اُٹھ آئی ہیں۔ ان کے ساتھ ان کی دو یتیم بھانجیاں بھی ہیں۔ ایک چھوکرا انہوں نے رکھ لیا ہے۔ تم میرے عزیز ہو اور اب ان کے قریب ترین پڑوسی ہو، میں نے سوچا تمہیں کہتا آؤں''۔

محسن صدیقی نے اخلاق کی چادر پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ خاطر جمع رکھیں میں ان لوگوں کا ہر طرح خیال رکھوں گا''۔

''جیتے رہو، تم سے یہی توقع تھی''۔

باہر نکل کر ٹھیکیدار فضل کریم نے ٹھنڈی سانس لی۔ موسم خشک ہو چکا تھا اور وہ اپنے چہرے پر ہواؤں کا لطیف لمس محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اب تک کی کارروائیوں کا جائزہ لیا۔ ساری اسکیمیں کامیاب ہوتی جا رہی تھیں۔ جانے کہاں سے میرن کی گلی میں ایک منہ بولا بھتیجا بھی نکل آیا۔ سعادت مند لڑکا ہے، میں نے پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی۔ بس ایک چال اور ٹھیک ہو جائے تو سمجھو بساط اپنی ہے۔

اتنے میں ماضی کے دھندلکے سے منشی فضل کریم نکل کر سامنے آ کھڑا ہوا اور اس نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیکیدار فضل کریم اب تم رنڈیوں کا مال بھی ہڑپ کرنے لگے، لعنت ہے تم پر''۔

اور ٹھیکیدار فضل کریم نے گرجتے ہوئے کہا۔ ''منشی فضل کریم تم ٹھہرے منشی، کاروبار کی پیچیدگیوں کو کیا خاک سمجھو گے۔ بس سر شتے میں بیٹھے دھیلے پیسے کی گڑبڑ کرتے رہو۔ تجارت، تجارت ہے۔ اس میں اونچ نیچ، شریف اور رذیل کی قید کہاں۔ راستہ ناپو بھائی دنیا تمہیں بھلا چکی ہے''۔

منشی فضل کریم سے پیچھا چھڑا کر جب وہ زلیخا کے یہاں پہنچا تو رات کے دس بج چکے تھے اور مہ جبیں تیاریوں میں مصروف تھی۔ آج انجینئر شرما نے اسے مدعو کیا تھا۔ یوں دعوت تو شبو کی بھی تھی، لیکن شبو کی ناک بہہ رہی تھی اور فضل کریم یہ نہیں چاہتا تھا کہ ان لڑکیوں کے متعلق جن کی تعریف میں اس نے انجینئر کے سامنے آسمان اور زمین کے قلابے ملا دیئے تھے۔ انجینئر کے ذہن میں کوئی برا تاثر پیدا ہو۔

مہ جبیں نے اسے دیکھتے ہی کمرے سے ہانک لگائی۔ ''خالو صاحب میں پانچ منٹ میں آتی ہوں، جب تک آپ خالہ سے باتیں کریں''۔

فضل کریم نے سوچا یہ آخری ٹکڑا ''آپ خالہ سے باتیں کریں'' تو بالکل بے محل لیکن اس رنگ محل میں آخر کس چیز کو بے محل کہا جائے۔

جاتے وقت اس نے چپکے سے زلیخا سے کہا۔ ''میں مہ جبیں کو پہنچا کر آتا ہوں۔ تم جاگتی رہنا''۔

آدھی رات کو ٹھیکیدار فضل کریم نے دروازہ کھٹکھٹایا، زلیخا جاگ رہی تھی۔ شبو سو چکی تھی۔

ٹھیکیدار کچھ دیر تو گم سم بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ایک تھیلے سے وہسکی اور سوڈے کی بوتلیں نکالیں۔ دو ایک پیکٹ میں کچھ تلے کا جو تھے، انہیں نکالتے ہوئے ٹھیکیدار نے کہا۔ ''آج کچھ شغل رہے، اس بھاگ دوڑ میں کافی تھک چکا ہوں'' اور زلیخا نے خوش ہو کر کہا ''بڑے وقت سے آگئی، میرا جی بھی بڑا اداس تھا''۔ اور ٹھیکیدار نے اس کے گال پر چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ ''کیوں اداس تھی میری جان''۔

دو پیگ ختم کر کے زلیخا نے ایک پھریری لی۔ بہار ٹھیٹھری بازار کی نذر ہو گئی، اور یہ خزاں ہے اتنی ہی اجاڑ اور بھیانک جتنی یہ میرن کی گلی۔

اور یکا یک اُسے غالب کی وہ غزل یاد آ گئی جسے نسیمہ بڑے سوز سے گاتی تھی۔

''سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں''

خود اس کا گلا تو ہمیشہ کا خراب تھا، استاد جی رکھے گئے، کئی سال ریاض کیا۔ خالہ کی دلی

تمنا تھی کہ کچھ فن سیکھ لے، لیکن یہ تو خداداد چیز ہوتی ہے۔ فن سیکھ بھی لیتی تو وہ آواز کہاں سے پاتی جو تارا، چندر کانتا اور نسیم نے پائی تھی۔

''جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں''

اس کا جی بھر آیا اور اس نے اپنا سر فضل کریم کے شانوں پر ڈال دیا۔ فضل کریم چوتھی پیگ ختم کر رہا تھا۔ آنسو کی دو گرم گرم بوندیں اس کے شانوں پر پڑیں تو وہ چونک سا گیا۔

''کیا بات ہے میری جان تمہیں کیا دکھ ہے''۔

اور فضل کریم نے کمھلائے پھولوں پر کچھ ایسی گرم گرم مہریں ثبت کیں کہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔ کسی کو اپنا ''مرد'' کہنے کی فطری جبلت اور آج جب وہ زندگی کے غلط موڑ پر پہنچ چکی تھی، تو جانے کیوں یہ ہر لحہ اور ہر گھڑی بیدار ہو جایا کرتی تھی۔ یوں فضل کریم اس کا شوہر ہو چکا تھا، مگر کیا فی الواقع وہ اس کا

اور جب اس کی آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ چکا تھا۔ فرش پر وسکی کی خالی بوتل پڑی تھی۔ لیکن یہ خالی کہاں ہے، اس میں تو رات کی کہانیاں پوشیدہ ہیں اور جیسے کنور بلراج بہادر نے اسے ساتویں آسمان سے پکارتے ہوئے کہا۔ ''زلیخا رانی کیا وہ رات پھر لوٹ آئی''۔

زلیخا نے دھیمے سے کہا۔ ''نہیں کنور جی وہ رات تو آپ کی امانت ہے، اور یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ تو محض سماجی مصلحتیں ہیں۔ سماجی مصلحتوں میں دل جیسی چیز کا تعاون کہاں اور اب دل بھی کہاں ہے وہ مبخت تو اگلے وقتوں کی ایک ٹوٹی پھوٹی سی عمارت ہے جہاں میری بلا سے بوم رہے یا

ٹھیکیدار فضل کریم جاگ چکا تھا۔ مہ جبیں رات کی دعوت سے واپس آ چکی تھی اور ٹھیکیدار نے دھیرے سے ایک ترپ کا پتہ پھینکتے ہوئے کہا۔

''بیگم وہ ٹھٹھری بازار والا مکان تو خالی ہی پڑا ہے''۔

''کوٹھی تو خالی ہی خالی ہے لیکن نیچے تین دکانیں کرائے پر لگی ہیں''۔

فضل کریم گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''کہاں کھو گئے ٹھیکیدار صاحب''۔

ٹھیکیدار نے اسے ٹالنا چاہا لیکن جب اس کا اصرار بڑھا تو اس نے اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں یاد ہوگا کوئی دو سال پہلے میں نے ثروت حسین کی پرانی حویلی خریدی تھی۔ یہ حویلی تمہارے مکان کے عقبی حصے میں پڑتی ہے۔ کافی بڑی ہے، پر اب تک خالی پڑی ہے''۔

''تو اب کیا ارادے ہیں''۔

''سوچ رہا تھا . . خیر جانے دو''۔ دراصل فضل کریم اس معاملے کو حسن تدبیر سے سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''جانے کیوں دوں، آخر کہتے کیوں نہیں''۔

''بات یہ ہے بیگم کہ میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے وہ یہ کہ دکانیں خالی کرادی جائیں۔ اور تمہارا مکان اور حویلی توڑ کر ایک کر دی جائے، اور اس میں ایک عمدہ سا مارکیٹ بنوایا جائے۔ اتنا بڑا پلاٹ ہے کہ کم از کم تیس دکانیں نکل آئیں گی اور اگر اوسطاً ساٹھ روپے مہینے پر بھی اٹھیں، تو مہینے میں اٹھارہ سو روپے آجاتے ہیں۔ ٹیکس اور دوسرے اخراجات کے بعد بھی ڈیڑھ ہزار روپے سے کسی بھی حال میں کم آمدنی نہیں ہوتی ہے''۔

''مگر وہ مکان . . وہ مکان تو میری ماں کی نشانی ہے ٹھیکیدار صاحب''۔ زلیخا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اور ٹھیکیدار نے مدلل گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''بھئی مکان بیچنے کی بات تو نہیں کی جارہی ہے، ہاں اسے نئی شکل دینا ہے۔ فی الحال تو وہ کوئی قابل قدر شے نہیں ہے، لیکن جب اسے توڑ کر مارکیٹ بنادیا جائے گا، تو وہ ایک بہت ہی قیمتی شے ہو جائے گی۔ تمہیں اگر مجھ پر بھروسہ نہیں ہے تو چلو لکھ دیتا ہوں کہ تمہارے حصے کی زمین میں جو دوکانیں پڑیں گی ان کا کرایہ تمہیں ملا کرے گا۔ مکان کو توڑ کر مارکیٹ بنوانے میں جو خرچ ہوگا، وہ میرا ہوگا''۔

زلیخا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''اصل یادگار تو وہ زمین ہے۔ مکان تو کسی بھی حادثے میں منہدم ہو سکتا ہے۔ اور اگر اس میں ایک مارکیٹ بن گیا، تو یقین جانو تمہاری والدہ کی روح بے حد خوش ہوگی''۔

چنانچہ جب ٹھیکیدار فضل کریم ترکش کے سبھی تیر استعمال کر چکا تو جواب کے انتظار میں

خاموش ہو گیا۔

"تو پھر جیسی آپ کی مرضی"۔

ٹھیکیدار فضل کریم کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے پر لگ گئے ہوں۔ یوں چپتی ہیں شطرنج کی چالیں۔ محسن صدیقی تو محض وقت برباد کرتا ہے۔

اور جب ٹھیکیدار فضل کریم نے خان بہادر کو رازدارانہ طور پر یہ خبر سنائی تو عظیم الدین نے اس کی جیب سے سو کا ایک نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔

"پری کو شیشے میں اتارنا کوئی تم سے سیکھے۔ میں غریب تو ناحق بدنام ہوں"۔ فضل کریم نے دھیرے سے کہا" خان بہادر ذرا آہستہ بولو دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں"۔

چنانچہ دوسرے ہی دن ضروری کاغذات ایک انجینئرس اینڈ پلانرس کی فرم کے سپرد کر دیئے گئے اور انہیں ایک اچھا سا نقشہ بنانے کا آرڈر دے دیا گیا۔

میرن کی گلی میں انہیں آئے ہوئے کئی دن ہو چکے تھے اور نئی جگہ کچھ کچھ مانوس سی ہوتی جا رہی تھی۔ پر ہوا یہ کہ ایک دن شاکر علی نے شام کی سیر سے واپس ہوتے وقت نیلی ایمبسڈر سی آر اے ۳۰۳۱ زینت کے دروازے پر کھڑی دیکھی تو چونک سا گیا۔

شاکر علی محکمہ آب پاشی میں ڈیلنگ اسسٹنٹ تھا۔ آدمی بلا کا ذہین تھا اور کاروں اور فونوں کے نمبر یاد رکھنے میں تو گویا اسے ید طولیٰ حاصل تھا۔

"یار شاکر علی وہ فیٹ سی آر اے ۴۳۵ کس کی ہے؟"۔

"ام اے خان، ڈپٹی سکریٹری بیراینڈ ایمپلائمنٹ ڈیپارٹمنٹ"۔

"اور ہندوستان سی آر اے ۸۰۳۷"۔

"ڈاکٹر بھٹاچاریہ ہارٹ اسپیشلسٹ"۔

"تمہیں سیٹھ ایس پی کے ریزیڈنس کا فون نمبر معلوم ہے"۔

"ہاں ہاں ۲۸۳۰۵"۔ بہت خوب، بہت خوب۔

اس کے گھر میں فون۔ کمال کیا آپ نے!

اس کی کار کا نمبر۔ توبہ کیجئے آپ۔ تو گویا یہ محرمیوں کی انتہا تھی۔

محسن صدیقی کا کامن روم لالٹین کی روشنی تلے جگمگا رہا تھا۔ شاکر علی کبھی کبھار کیرم کے

دو ایک ہاتھ کھیل لیتا تھا اور بس۔ دراصل کامن روم میں اس کا نام ان اہم شخصیتوں کے ساتھ لیا جاتا تھا جن کی گرہ میں سنسنی خیز خبریں، محلے اور شہر کی اہم وارداتیں اور تازہ بہ تازہ لطیفے ہوا کرتے تھے (کہ دنیا بھی ایک لطیفہ ہے اور اگر واقعی کوئی سنجیدہ سی شے ہوتی تو یہ محسن صدیقی کی بیٹھک کہاں سے آتی)۔

تو آتے ہی چھڑ گئے شاکر علی۔ ''برادران وطن آج میں نے اپنی انہیں کمزور آنکھوں سے جن پر ایک عدد عینک چڑھی ہے، ٹھیکیدار فضل کریم کے دروازے پر نیلی ایمبسڈر سی. آر. اے.۳۰۳۱ کھڑی دیکھی ہے''۔

کیرم کی کھٹ کھٹ بند ہوگئی، تاش کے پتے ٹھٹھک کر رک گئے، پیادے نے اپنی چال روک لی۔ ''اور یہ سی. آر. اے ۳۰۳۱ کس کی ہے''۔ محسن صدیقی نے سوال کیا۔

''اجیت نرائن سنہا انڈر سکریٹری محکمہ تعمیرات عامہ''۔

''ارے وہی جس کے متعلق لونڈیوں کے قصے مشہور ہیں''۔

''جی جناب سولہ آنے وہی''۔

اور خورجہ کے محمد احمد خاں نے، جو محض لونڈیوں کے ذکر پر چونک پڑے تھے کھنکھارتے ہوئے کہا۔ ''بھئی یہ معاملہ تو سنگین دکھائی دے رہا ہے''۔

''ہاں جی سنگین ہے اور سو فیصدی سنگین ہے''۔ محسن صدیقی نے ہانک لگاتے ہوئے کہا۔

''علی حسن اس معاملے کو انکوائری کمیشن کے سپرد کرو''۔

''غلام حکم کی تعلیم کرے گا عالیجاہ''۔ علی حسن نے مودبانہ جواب دیا۔

حکم کے بموجب اس وقت دو افراد یعنی بشیر علی اور محمد نیاز پر مشتمل ایک کمیشن کا قیام عمل میں لایا گیا، اور کمیشن کے کاموں کے لئے ایک روپے کی رقم ہنگامی چندے میں وصول کی گئی۔ اس سے خرید و دو عدد پنسلیں اور کاغذ، اور کل سپیدۂ صبح نمودار ہونے کے بعد اپنا کام شروع کردو۔

بشیر علی اور محمد نیاز نے کاغذ اور پنسلیں سنبھالیں اور کمیشن کے کاموں میں لگ گئے۔ بشیر علی ادھر کئی برسوں سے بساطی کی دکان کھول کر بیٹھ گیا تھا اور محمد نیاز اسکوٹریں ہانکتا تھا۔

چنانچہ مولوی سلیم اللہ جو اردو پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے جب کبھی دونوں کو اکٹھ دیکھ لیتے تو کہہ اٹھتے۔

''کیسے کیسے انقلاب آئے۔ اپنے پرائے ہو گئے۔ لوگوں کے دل بدل گئے، لیکن تم لوگ نہیں بدلے وہی کاف قاف بنے پھرتے ہو''۔

تو بشیر علی اور محمد نیاز کی باہمی رفاقت نے بیس بہاریں دیکھی تھیں۔ لیکن بھیا ''بہار کو تو نظر لگ گئی بہار کہاں''۔ بشیر علی ایک آہ سرد کھینچ کر کہتا اور محمد نیاز خلاؤں میں گھورتے ہوئے بول اٹھتا۔ ''ٹھیک کہتا ہے تو چڑیا کے''۔

اور بہار کے دن وہ تھے کہ بشیر علی اور محمد نیاز، مولوی برکات کے مکان کے پچھم مرلی دھر کے اکھاڑے کے چبوترے پر برگد کے سائے میں بیٹھ کر پیا کرتے تھے۔ محلے والے کہتے، ''جیٹھ بیساکھ میں تاڑی پانی کرنا عام بات سہی لیکن ان مسٹنڈوں کو تو جیسے اس کے علاوہ کوئی دوسرا کام ہی نہیں ہے''۔

مولوی برکات کی لونڈیا۔

''ہائے کس ظالم کا نام لیا تو نے نیاز'' بشیر علی دل پکڑ کر بیٹھ جاتا اور محمد نیاز کہتا۔ ''بشیرے کی اولاد بڑا سورما بنتا ہے۔ جب اس کا نکاح تیرے باپ سے پڑھایا جا رہا تھا تو گم صم بیٹھا کیا کر رہا تھا''۔

اور بشیر علی آنکھیں نکال کر کہتا ''دیکھ بے نیاز باپ تیرا ہوگا، زبان سنبھال کر بات کیا کر''۔

محمد نیاز مسکراتے ہوئے ایک بھرپور چپت مار کر کہتا۔ ''حرامزادہ بننے لگا ہے۔'' تو یہ مولوی برکات کی لونڈیا زینت تھی جو انہیں یہاں تک کھینچ لائی تھی۔ بشیر بڑا گبرو جوان تھا۔ سانولی رنگت، نکلتا ہوا قد، کسا کسا جسم۔ اس کی تو جوانی کی قسم کھائی جاتی تھی۔ لیکن اپر پرائمری پاس کرنے کے بعد تو بشیر اور نیاز نے وہ ہاتھ پیر پھیلائے کہ محلے والوں نے سمجھ کہ وہ آبادی میں خونخوار درندے نکل آئے ہیں۔

بشیر تو یتیم تھا اور اگر اس کے ماموں محمد جان نے اس کی اور اس کی ماں کی پرورش نہ کی ہوتی تو بشیر ہوتا کسی یتیم خانے میں اور ماں کہیں نوکری کرتی دکھائی دیتی، لیکن چار سال کی عمر

میں جب اس کا باپ مرگیا تو محمد جان اسے شاہ پور سے یہ کہہ کرلے آیا کہ باپ مرگیا تو کیا ہوا ماموں جو زندہ ہے۔ ہر چند اس کے دادیہال والوں نے بشیر پر اپنا حق جتایا لیکن محمد جان جیسے لٹھ باز کے آگے کس کی چلتی۔ تو بشیر نے جب اپر پرائمری کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا اور ماموں سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑانا چاہا کہ غریب لڑکوں کو اس سے زیادہ پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے تو ماموں نے ایک ایسا زوردار گھونسہ اس کی پیٹھ پر مارا کہ وہ بلبلا اُٹھا۔ ''خبردار جو پھر کبھی کوئی ایسی بات کہی ہے''۔ بشیر ماں کے پاس جا کر خوب رویا۔ ماں کا دل پسیجا تو وہ سارے پچھلے حساب کتاب یک لخت بھول گئی اور دھیرے سے احتجاجاً بول اٹھی کہ ''بھیا یتیم سمجھتے ہیں تب ہی تو ایسی بے دردی سے مار دیا میرے بچے کو''۔ چنانچہ جب یہ بات محمد جان کے جان میں پہنچی تو اس نے مسجد میں جا کر قسم کھائی کہ وہ آئندہ کبھی بھی بشیر پر ہاتھ نہیں اُٹھائے گا، خواہ اس کے نتائج کتنے ہی بُرے کیوں نہ ہوں۔

محمد نیاز کا باپ محمد زبیر زندہ تھا اور اپنی قسمت کو روتا تھا کہ اللہ نے دو اولاد نرینہ عطا کی۔ ایک شادی ہوتے ہی سسرال کا ہو گیا اور کبھی کبھی خط بھیج دیتا ہے کہ میں بخیر ہوں اور باری تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ آپ لوگ بھی مع الخیر ہوں گے۔ دوسرا یہ محمد نیاز ہے جسے اپر پرائمری کے بعد کتنی ہی بار اسکول بھیجا گیا لیکن کمبخت نے کیا کیا گل کھلائے۔ اسکول سے بھاگ جاتا، کتابیں بیچ کر سنیما دیکھ لیتا۔ برابر تو اسکول سے اس کی شکایتیں آتیں اور ایک بار تو اس نے حد ہی کر دی تھی۔ ماسٹر اوما کانت کے لڑکے کو بری طرح پیٹ دیا ظالم نے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ فرقہ وارانہ فساد ہوتے ہوتے رک گیا، ورنہ اس حرامزادے کی وجہ سے کئی معصوموں کا خون ہو جاتا اور یہ سب اس حرامی پلے بشیر علی کی صحبتوں کا نتیجہ تھا۔ دونوں میاں بیوی کا یہی خیال تھا کہ محمد نیاز تو بالکل بے زبان تھا، لیکن جب سے اس بشیر علی کی صحبت میں پڑا بالکل آوارہ ہو گیا۔ خدا اس سے سمجھے۔

بیساکھ کے دن تھے۔ دن اور رات کا فرق مٹ چکا تھا۔ گویا ان لوگوں نے طے کر لیا تھا کہ مرنا ہے تو اسی چبوترے پر اور جینا ہے تو اسی چبوترے پر۔ پیتے پیتے نیند آ جاتی تو وہیں لڑھک جاتے اور پھر جب آنکھ کھلتی تو دور شروع ہو جاتا۔ ان دنوں علی حسن دس بارہ سال کا تھا۔ پڑوس ہی میں رہتا تھا، اس لئے اس کی ماں نے اسے مولوی برکات کے مدرسے میں بیٹھا دیا تھا:

اس کا باپ بی حسن کارڈ بورڈ کے ڈبے بنا کر تھوک فروش بساطیوں کو سپلائی کیا کرتا تھا۔ علی حسن کا یہ حال تھا کہ مولوی برکات کی آنکھ بچا کر مدرسے سے غائب ہو جاتا اور مرلی دھر کے اکھاڑے کے پیچھے گلی میں لونڈوں کے ساتھ گولیاں کھیلتا رہتا۔ ایک دن بشیر علی نے محمد نیاز سے کہا۔

''علی حسن کو بھی اپنا پارٹنر بنا لے یار۔ بازار سے پکوڑیاں لایا کرے گا''۔ اور محمد نیاز نے ترنگ میں جواب دیا۔ ''ضرور رکھ لے مرے یار اس سور کی اولاد کو''۔

چنانچہ دوسرے دن سے علی حسن محمد نیاز اور بشیر علی کا ہم نشیں بن گیا۔ علی حسن منصب ساقی گری پر بحال تھا اور صبح سے شام تک محمد نیاز کی گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہونے کی مشق کر رہا تھا۔ لیکن بشیر علی کے لئے تو وہ ایک بڑی کارآمد سی شے ثابت ہوا۔ ان دنوں عشق کچھ تیز گام سا ہو گیا تھا۔ علی حسن مولوی برکات کے گھر میں آتا جاتا رہتا اور مولوی برکات کی عدم موجودگی میں زبین کو بشیر علی کے پیغامات پہنچا دیا کرتا۔ چھوٹے پیغام بڑے پیغاموں میں بدل گئے۔ پھر ان پیغاموں میں دل چیر کر رکھ دینے کے لئے، ایک آنے والی لائبریری سے رومانی ناولیں لائی جانے لگیں اور ناول کو سامنے رکھ کر بڑے لمبے لمبے عشقیہ خطوط لکھے جاتے۔

اور محمد نیاز جل کر کہتا۔ ''لکھ دے بیٹا''۔

ترے عشق میں پیاری   رات بھر پیتا ہوں تاڑی

زبین کو موا محمد نیاز پھوٹی آنکھ نہیں بھاتا تھا، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اسی نے اس کے مرلی منوہر کو مرلی دھر کے اکھاڑے کے چبوترے پر پلا پلا کر خراب کر دیا تھا۔ اور ایک بار جب زبین نے اپنی عزیز سہیلی رئیسن سے کہا کہ ''اس سانورے پیا پر تو مر مٹنے کو جی چاہتا ہے'' تو رئیسن نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''چپ رہ ری ونڈیا، تجھ پر تو عشق کا بھوت سوار ہے اور اگر کہیں سن لیا چچا برکات نے تو چوٹیا کاٹ دیں گے تیری، اور میں بھی مفت میں ماری جاؤں گی''۔

آخر یہ سلسلہ کب تک چلتا۔ نامہ بر ایک دن جب مع ایک طویل محبت نامے کے مولوی برکات کے پچھلے دروازے سے داخل ہوا تو جانے کہاں سے اسی وقت مولوی برکات بھی نازل ہو گیا۔ علی حسن پر جو اس نے قہر آلود نگاہیں ڈالیں تو وہ وہیں سکتے کے عالم میں کھڑا ہو گیا اور جب جامہ تلاشی ہوئی تو اس کی جیب سے ایک آنے والی ناول کا تازہ بہ تازہ مسودہ برآمد ہوا۔

پھر تو مولوی برکات نے علی حسن کی خوب ہی خبر لی۔ ''کہہ دینا اس چڑیا کے غلام کو کہ میں زینن کو ذبح کر دوں گا مگر اس کی شادی اس حرامزادے تاڑی باز کے ساتھ نہیں کروں گا''۔

مولوی برکات کی گرجدار آواز سارے محلے میں پھیل گئی، پر سیاق وسباق سے لاعلمی کی بنا پر کسی کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ مولوی برکات کون سی ''قاعدہ بغدادی'' کا سبق دے رہا ہے۔ علی حسن روتا دھوتا واپس پہنچا تو محمد نیاز نے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے حرامزادہ ماں کے پیٹ سے نکل کر آ رہا ہے''۔

اس رات چبوترے پر بشیر علی اور محمد نیاز کے علاوہ اصغر حسین بھی موجود تھا۔ اصغر حسین اتواری خاں بیڑی مرچنٹس کے یہاں بیڑیاں بنایا کرتا تھا اور شام کو جب دُکان سے واپس آتا تو تھکن دور کرنے کے لئے دو گھڑی بشیر علی اور محمد نیاز کے ساتھ بیٹھ رہتا۔ انہیں گلاس میں تاڑی ڈھال کر دیتا (کہ شام ہوتے ہی علی حسن گھر چلا جاتا تھا) اور اپنا حساب کھرا کر لیتا۔ یہ شغل چل رہا تھا کہ اتنے میں مولوی برکات، عشا کی نماز کے بعد مسجد سے واپس آتا دکھائی دیا۔ محمد نیاز تو چپ سادھ کر پڑ رہا۔ اصغر حسین بھی سر جھکا کر بیٹھ رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو، لیکن بشیر علی نے پورا ایک گلاس چڑھا لیا اور جیوں ہی مولوی برکات چبوترے کے قریب پہنچا وہ یکبارگی اس کے قدموں پر جا گرا۔ یہ چیزیں اتنی اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوئیں کہ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بشیر علی گڑگڑا رہا تھا۔ ''یہ بندۂ حقیر ایک فریاد لے کر آیا ہے میرے آقا۔ .. میں چڑیا کا غلام، سچ مچ کا غلام بن کر حضور کی خدمت میں لگا رہوں گا''۔ بولتے بولتے بشیر علی نے رونا شروع کیا۔ بڑی بڑی مشکلوں سے محمد نیاز اور اصغر حسین نے اسے الگ کیا، اور یوں مولوی برکات نے گھر کی راہ لی۔ سنتے ہیں کہ وہ رات مولوی برکات نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی اور سویرا ہوتے ہی کالے شاہ کے دروازے پر مولوی عبدالرحیم کے لڑکے عبدالکریم سے زینن کی بات پکی کر آئے۔ عبدالکریم دیوانی کچہری میں پیشکار تھا۔ اور ''پیشکاروں کے گھر کب کسی لڑکی نے دکھ سہے ہیں''۔ یہ خیال تھا مولوی برکات کا۔

مگر اس دن کے بعد سے مرلی دھر کے اکھاڑے کا چبوترہ سونا پڑ گیا۔ بشیر علی کو تو کئی دنوں تک جیسے چپ سی لگ گئی۔ ان معاملوں میں محمد جان بڑا جہاندیدہ آدمی تھا۔ اس نے بھانجے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا تیرا باپ شیر تھا، تیرا ماموں شیر ہے اور اگر تو بھی اپنے کو شیر

ثابت کرنا چاہتا ہے تو شیروں کی طرح حالات کا مقابلہ کر۔ اور یہ کہ اگر زرین بیاہ دی گئی تو کیا ہوا محلے میں کئی لڑکیاں اور بھی ہیں"۔ پر اب بشیر علی کو یہ سارا چکر ہی بیکار دکھائی دیتا تھا۔ یہ کیا کہ آہیں بھرو، محبت بھرے خطوں کے لئے ایک آنے والی ناول سے مواد حاصل کرو اور نتیجہ صفر۔ بالکل صفر۔ کوئی رقیب روسیاہ۔ دیوانی کچہری کا کوئی پیشکار محبوبہ کو بیاہ لے جائے اور اس نے محمد نیاز کو رازدارانہ لہجے میں کہا۔ سیاست، محبت وغیرہ ہم جیسے آزاد منش لوگوں کے لئے بالکل ہی ناموزوں شے ہے۔ ہم ٹھہرے جنگل کے شیر اور یہ کام تو دراصل اصطبل کے گھوڑوں کا ہے"۔

تو جنگل کے شیر اپنی غذا فراہم کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ انہی دنوں منصور احمد بمبئی سے کچھ پیسے کما کر لایا تھا۔ منصور احمد دو سال پہلے نبی حسن کے کارخانے میں ڈبے بنایا کرتا تھا۔ سوا روپے روزانہ اجرت ملتی تھی۔ جانے کیسے اسے سینما دیکھنے کا چسکا لگ گیا۔ ہر نئی فلم کوئی کئی بار دیکھا کرتا۔ ایک بار باپ نے اس کی حرکت سے عاجز آکر خاصی مرمت کر دی۔ اس نے سوچا یہاں جان کی سلامتی نہیں ہے۔ ماں کے پاندان سے بیس روپے چوری کئے۔ کچھ پیسے نبی حسن سے لئے اور سیدھا بمبئی بھاگ گیا۔ وہاں دو سال تک کسی ہوٹل میں بیرا بنا رہا اور اب یہ بخشش کی رقم تھی جسے وہ یہاں آکر دوستوں پر لٹا رہا تھا۔

بشیر علی، محمد نیاز اور منصور احمد ان دنوں مشت قسادی الاضلاع بنے پھرتے تھے۔ اب انہیں میرن کی گلی میں کم کم دیکھا جاتا تھا۔ بشیر علی کا خیال تھا کہ زرین کے بیاہ جانے کے بعد محلے پر نحوست سی برسنے لگی۔ محمد نیاز کو تو پہلے بھی کبھی عشق وشق کا چکر نہیں تھا اور اب چونکہ بشیر علی کو میرن کی گلی سے وحشت سی ہونے لگی تھی، اس لئے وہ بھی وہاں سے بھاگ جانے ہی میں عافیت محسوس کرتا تھا۔ رہ گیا منصور احمد تو وہ تو حاتم وقت تھا۔ بقول بشیر علی خود بھی غنی تھا اور دل بھی اس نے غنی پایا تھا۔

چنانچہ دو چار ہی مہینے کے عرصے میں ٹھیٹھری بازار کے سبھی کوٹھے ان کے جانے پہچانے ہو گئے اور دیسی شراب خانے والے ان کی شخصیت سے مرعوب دکھائی دینے لگے۔ غرض کہ ان دنوں اس مثلث قساوی الاضلاع کی بڑی دھوم تھی۔

لیکن بشیر علی نے اچانک سبھوں کو چونکا دیا اور وہ اس طرح کہ ایک سہانی صبح کو جب منصور احمد اور محمد نیاز کو یہ خبر ملی کہ آج شام بشیر علی کا نکاح محمد جان کی بیٹی کلثوم سے ہونے

والا ہے تو انہوں نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔ ''بشیر نے آخر یہ رازداری کیوں برتی''۔
سچ تو یہ ہے کہ یہ اقلیدسی حساب کتاب کب تک چلتا؟ زندگی بالآخر ایک ٹھوس حقیقت تھی اسے بشیر علی بھی سمجھتا تھا اور محمد نیاز اور منصور احمد بھی سمجھتے تھے۔ کسی نے کہا کہ بشیر علی نے اچھا ہی کیا کہ اپنا ایک محور قائم کر لیا کہ زندگی اپنے محور پر نہ چلے تو پھر

اور اب ادھر کئی سال سے بشیر علی بساطی کی دکان کھول کر بیٹھ رہا تھا۔ محمد نیاز اسکوٹر ہی چلا رہا تھا اور منصور احمد نے کارڈ بورڈ کے ڈبوں کا کام پھر شروع کر دیا تھا۔ زندگی میں ایک ضبط ایک نظم پیدا ہو گیا تھا۔ پر اب بھی کبھی کبھی جب محسن صدیقی کی بیٹھک میں بیتے ہوئے دنوں کا اور مخصوص طور پر زبین کا ذکر آ جاتا تو بشیر علی جیسے ماضی کی پناہ گاہ میں چھپنے کی کوشش کرنے لگتا۔ اس ساری داستان میں زبین گویا اس کی شکستوں کا آغاز بن کر آئی تھی۔

بشیر علی نے عظیم الدین کے لئے اسپیشل چائے کا آرڈر دیتے ہوئے کہا۔
''کہئے چچا کیا حال ہے؟ ادھر آپ اکثر دیکھے جاتے ہیں، خیر تو ہے؟''
''ہاں بھئی وہ ٹھیکیدار فضل کریم کی نئی بیگم تمہارے پڑوس میں آ گئی ہیں''۔
''ٹھیکیدار فضل کریم کی نئی بیگم؟''
''کوچہ دینا ناتھ کی ایک بیوہ سے حال ہی میں نکاح کیا ہے''۔
''اور یہ لوگ جو موٹروں پر لد لد کر آتے ہیں کیا ٹھیکیدار فضل کریم کے سسرالی عزیز ہیں''۔
''ارے نہیں سسرالی عزیز کہاں سے آئے۔ یہ تو انجینئر اور آفیسر لوگ ہیں۔ ٹھیکیدار فضل کریم بڑا آدمی ہے اس سے ملنے بڑے ہی لوگ تو آئیں گے''۔
''پر اس سے ملنے تو اس کی صدر بازار والی کوٹھی میں بھی جا سکتے ہیں۔ کیا بھلا سا نام ہے۔ ہاں یاد آیا۔ ''نشاط محل''۔
''عظیم الدین لاجواب سا ہو گیا۔ گڑبڑا کر بولا'' بھئی میں کیا جانوں کہ یہاں کیوں آتے ہیں۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے بتا دیا''۔
اور بشیر علی نے غایت بے تکلفانہ انداز میں کہا۔ ''چچا ہم پیشہ لوگوں سے رازداری برتنا اچھا نہیں ہوتا''۔

یہ چال کامیاب ہوئی اور عظیم الدین نے ہتھیار ڈالنے کے انداز میں کہا۔ ''جب جانتے ہی ہو تو مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں''۔

''مگر آخر ہے کون؟''

''ارے وہی زلیخا، اس کی بھانجی مہ جبیں اور مظفر پور کے ایک مولوی سبحان مرحوم کی لونڈیا شبو''۔

''تو گویا یہ چکر ہیں''۔

''بھائی ٹھیکیدار میرا پرانا دوست ہے۔ میں نے اس کے برے دن بھی دیکھے ہیں اور اچھے دن بھی دیکھ رہا ہوں۔ میرا کیا ہے، اکیلا آدمی ہوں، ساری زندگی عیش سے گزری اور اب بھی عیش سے گزرتی ہے۔ فضل کریم میرے مشاغل جانتا ہے اور میں اس کے مشاغل سے بخوبی واقف ہوں''۔

خان بہادر نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''بشیر علی ٹھیٹھری بازار کو کہیں نہ کہیں آباد ہونا ہے خواہ وہ میرن کی گلی میں آباد ہو یا کہیں اور''۔

چنانچہ محمد نیاز کام سے واپس آیا تو بشیر علی نے اس کے سامنے رپورٹ پیش کی اور اسے جلد ہی قلمبند کرنے کی فرمائش کی کہ محسن صدیقی کا تقاضہ زور پکڑتا جا رہا تھا اور محمد نیاز نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ ''کمیشن کو مارو گولی، آج ذرا زلیخا اور اس کی بھانجیوں سے مل آئیں''۔

بشیر علی نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ''واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں''۔

اس پر محمد نیاز نے بڑھ کر اس کے کیش بکس سے پانچ کا ایک نوٹ نکال لیا اور خود بھی جیب سے پانچ کا ایک نوٹ نکالتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہوئے دس روپے، اب کیا پان کی دو گلوریاں اس سے زیادہ مہنگی ہوں گی۔ چلو آج ذرا بزنس کی باتیں بھی ہو جائیں''۔

زلیخا سوچتی تھی میرن کی گلی میں زندگی اتنی پر شور نہیں ہے، بس ایک دھیمی دھیمی سی خاموش سی فضا ہے۔ مگر شکر ہے کہ کام یہاں بھی چل گیا۔ مہ جبیں ایک اژدھے سے پینگ بڑھا رہی ہے، جس نے صرف پچھلے دو چار برسوں کے اندر ہلدی اور سیاہ مرچ میں کئی لاکھ بنائے ہیں۔ شبو بھی کچھ کچھ طور طریقے سیکھ رہی ہے۔ مگر ہائے کمبخت اپنا ماضی نہیں بھولتی۔ مگر یہ ماضی بھی کوئی بھلانے والی چیز ہے زلیخا بائی۔ پر یہ بھی کیا کہ اس بڑھیا کو ہر مہینے تیس روپے بھیجے جا

رہے ہیں اور ہر خط میں یہ بات بار بار لکھی جا رہی ہے کہ میں یہاں ایک مدراسی افسر کے بچوں کی آیا ہوں۔ صاحب لوگ بڑے مہربان ہیں اور پچاس روپے تنخواہ اور کھانا دیتے ہیں۔ کھانے میں کھٹائی اور مرچ کا استعمال بہت زیادہ کرتے ہیں۔ لیکن اب تو میں ان چیزوں کی عادی ہوتی جا رہی ہوں اور زلیخا کو ایسا محسوس ہوا جیسے شبو واقعی مرچ اور کھٹے کی عادی ہوتی جا رہی ہے۔ وہ اس طرح کہ اوما شنکر کا لڑکا روی شنکر اس سے قریب ہوتا جا رہا ہے مگر اس نے تو اس کی باتوں کا کبھی بھی برا نہیں مانا۔ وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے۔ روی شنکر نے باپ سے الگ ہو کر اپنا کام شروع کیا ہے۔ ہو جائے گا وہ بھی کسی دن باپ کے مقابلے کا ٹھیکہ دار کا بچہ ہے پیسے بنانا جانتا ہے۔

کوئی دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ شبو نے سوچا۔ ہو گا وہی مہ جبیں کا اڑھتیا بابو بجرنگ لال۔ روی شنکر کو آنا ہوتا ہے تو پہلے ہی کہلوا دیتا ہے۔ مگر ایسی ہی دستک، ٹھیک ایسی ہی دستک تو ابا بھی دیا کرتے تھے۔ پتلے دبلے سے ابا۔ اور شبو کو ایسا محسوس ہوا جیسے ابا موتی جھیل کی مسجد سے عشا کی نماز پڑھ کر آ چکے ہیں۔

''کیا پکایا ہے میری شبو بیٹی نے''۔

''اری شبو دیکھ باپ کو کھانا گرم کر کے دینا''۔

''رہنے دو جی اب اتنی رات گئے کیا میری بیٹی چولھا سلگائے گی''۔

''نہیں ابا گرم کر دیتی ہوں''۔

''کتنا خیال ہے میری بیٹی کو۔ کبھی تم نے اتنا خیال کیا''۔

''ہاں جی اب آنکھیں چلی گئیں تو جو جی چاہے کہہ لو''۔ اور ابا آبدیدہ سے ہو گئے کہ اس خوش مذاقی کا انجام وہی ہوا جو اکثر ہوتا آیا تھا۔ اماں کی محرومیاں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بیچارے ابا اماں کی فکر میں سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے اور آخر . آخر موت ہے... آخر موت ہے آخر موت ہے...

جیسے کسی نے سوال کیا۔ ''شبو بیگم موت اچھی یا یہ زندگی''۔

''سچ پوچھو تو بھی اس طوفانی زندگی میں کوئی کیا سوچ سکتا ہے۔ کسے سوچنے کی فرصت ہے۔ اور میں تو ایک مدراسی افسر کے بچوں کی آیا ہوں''۔

مہ جبیں نے دروازہ کھولا۔ محمد نیاز نے بڑھ کر پوچھا۔ ''زلیخا بائی ہیں''۔
''کہاں سے آئے ہیں''۔
''کہہ دیجئے پرانے ملنے والے ہیں''۔
زلیخا کے کان کھڑے ہوئے اور اس نے وہیں سے آواز دی۔ ''لے آؤ انہیں کون صاحب ہیں''۔
''پہچانا ہمیں زلیخا بائی''۔
''صورت آشنا تو ضرور ہیں مگر اب تو کچھ یاد نہیں رہتا''۔
پھر جب انہوں نے اپنا تعارف کرایا تو زلیخا نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ''بھئی ہم نے تو اپنی زندگی کا رخ ہی بدل دیا''۔
اور بشیر علی نے خلاؤں میں کسی چیز کو تلاش کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اپنی زندگی کا رخ بدل دیا، سی آر اے ۳۰۳۱ نے اپنا رخ بدل دیا، یہ سب وقت وقت کی بات ہے زلیخا بائی''۔
زلیخا نے محسوس کیا کہ وہ گفتگو کو کسی اور رخ پر لے جانا چاہتے ہیں۔ ''آخر مطلب کیا ہے بھائی صاف صاف کہو''۔
اور محمد نیاز بول اٹھا۔ ''کچھ نہیں، کچھ نہیں زلیخا بائی۔ بات یہ ہے کہ تمہیں اگر ٹھیٹھری بازار آباد کرنا تھا تو لائسنس تو لے لیتیں ہم لوگوں سے''۔
''لیکن تم کیا خدائی فوجدار ہو۔ ہمارا گھر ہے ہم رہتے ہیں''۔
''سنو زلیخا بائی اگر بات آسانی سے طے پا جائے تو ٹھیک ہے ورنہ ''
''ورنہ تو کیا کرے گا ٹکے کا چھوکرا''۔
اور محمد نیاز نے گرجتے ہوئے کہا۔ ''زلیخا بائی زبان کو لگام دو۔ یہ میرن کی گلی ہے ٹھیٹھری بازار نہیں ہے۔ یہاں ایک ایک بات کی پرسش ہوگی۔ تمہارے یہاں شراب کے دور چلتے ہیں۔ بھڑوے پہنچتے ہیں اور شام ڈھلے چمکتی کاروں پر گاہک آتے ہیں''۔
''تیری ماں کے خصم آتے ہیں''۔ زلیخا نے چپل نکالتے ہوئے ہانک لگائی۔
''شبو، مہ جبیں ذرا ادھر آنا۔ میں بتاتی ہوں ان حرامزادوں کو۔ دنیا میں کوئی کام نہیں تو یہاں آجاتے ہیں مرنے کے لئے''۔

بشیر علی اور محمد نیاز ہانپتے کانپتے بھاگے۔ انہوں نے گلی میں پہنچ کر ذرا دم لیا۔ رات کے کوئی دس بج چکے تھے۔ محسن صدیقی کی بیٹھک جمی تھی۔ محمد نیاز نے اعلان کیا۔

''کمیشن کی رپورٹ تیار ہو چکی ہے، وہ کل آپ لوگوں کے سامنے پیش کی جائے گی''۔

''ابھی کیوں نہیں''۔ محسن صدیقی نے ان کے بگڑے چہروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''رات زیادہ ہو چکی ہے اور پھر اس مہم کی آخری منزل نے ہمارے مزاج درہم برہم کر دیے ہیں''۔ بشیر علی نے بامحاورہ زبان استعمال کرنے میں عافیت سمجھی۔ دوسرے دن وہ لوگ سات بجے شام کو محسن صدیقی کی بیٹھک میں آدھمکے۔

کمیشن نے کامن روم کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرنے سے پہلے راہ کی پیچیدگیوں اور اپنی کاوشوں کا ذکر ضروری سمجھا۔ اس تمہید کے بعد بشیر علی نے بتایا کہ مکان زلیخا بائی نے ٹھیکیدار فضل کریم کی وساطت سے خریدا ہے۔ زلیخا بائی ٹھٹھیری بازار کی مشہور طوائف تھی اور اب ٹھیکیدار فضل کریم کے نکاح میں آچکی ہے۔ سوئے اتفاق اسے اس ڈھلتی عمر کے دو سہارے مل گئے ہیں۔ ایک اس کی بھانجی مہہ جبیں اور ایک شبو جو مظفر پور کے ایک مولوی سبحان مرحوم کی لڑکی ہے۔ فضل کریم ان لڑکیوں کو بڑے افسروں اور انجینئروں کے یہاں پیش کرتا ہے کہ اس سے بڑی رشوت اور کیا ہو سکتی ہے۔ مہہ جبیں سرائے گنج کے مشہور آڑھتیے بابو بجرنگ لال کی منظور نظر ہے اور ٹھیکیدار اوما شنکر کا لڑکا روی شنکر شبو سے راہ ورسم بڑھا رہا ہے۔ خان بہادر عظیم الدین شراب کی بوتلیں لاتا ہے، گاہک لاتا ہے اور اس کے عوض خود بھی عیش کرتا ہے۔ ہم لوگوں نے کئی ایک بھڑووں کو بھی آتے جاتے دیکھا ہے لیکن بیشتر کام خان بہادر اور فضل کریم کے ذریعہ طے پاتے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ زلیخا میرن کی گلی میں بھڑووں کا آنا جانا پسند نہیں کرتی ہے، لیکن محض پرانے تعلقات کی بنا پر کچھ بول بھی نہیں پاتی ہے۔

پوری مجلس ہمہ تن گوش تھی۔ رپورٹ ختم ہونے پر محمد احمد خاں نے دریافت کیا ''یہ خان بہادر عظیم الدین کون صاحب بہادر ہیں''۔

اور محسن صدیقی نے انہیں خان بہادر سے متعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''تھے شہر کے ایک رئیس اعظم خان بہادر نصیر الدین انہیں کے پوتے ہیں''۔

محمد احمد خاں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''حد ہو گئی اتنے بڑے آدمی کا پوتا اس

شغل میں ہے''۔

علی حسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹی لائن ہے خاں صاحب چھوٹی لائن

محمد احمد خاں کچھ دیر تو سوچتے رہے اور پھر خود ہی کچھ سوچتے ہوئے بول اٹھے۔ ''اچھا اچھا تو یوں کہو''۔

''خاں صاحب دراصل اس قماش کے لوگ اپنے دلوں میں سماج کے لئے ایک خاص انتقامی جذبہ رکھتے ہیں''۔ محسن صدیقی نے اس مسئلے کے نفسیاتی پہلو پر روشنی ڈالنی چاہی۔ اور بابو شیونرائن نے جو میونسپل کارپوریشن میں اوورسیر تھے اور تقسیم سے پہلے بڑی شستہ اردو بولتے تھے گلا صاف کرتے ہوئے کامن روم کو خطاب کیا۔ ''مجھے تو اس بات کا آشچریہ ہے کہ ہماری اس پوتر بھومی پر ویشیائیں کہاں سے آ گئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ پردیسیوں سے سانسکرتک آدان پردان کر کے ہمارے پرکھوں نے بڑی بھول کی تھی''۔

چنانچہ بابو شیونرائن نے جو ہمہ وقت سماجی، تہذیبی، سیاسی اور تاریخی مسائل پر اپنی دو ٹوک رائے دیا کرتے تھے، جلسے کو داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ لوگ بھی میرے وچاروں سے سہمت ہوں گے''۔

اور علی حسن نے جس کی سمجھ میں ان کے وچار کیا خاک آئے ہوں گے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''وہ تو سب ٹھیک ہے بابو صاحب، پر حکومت نے جب یہ قانون نافذ کیا ہے تو اسے ان لوگوں کا کوئی نہ کوئی انتظام بھی کرنا چاہئے''۔

محسن صدیقی نے حکومت کی پرزور وکالت شروع کر دی۔ ''دراصل حکومت اس دھندے کو پرائیویٹ سیکٹر سے پبلک سیکٹر میں لانا چاہتی ہے، چنانچہ یہ مرحلہ کافی دشوار کن ہے اور بتدریج حل ہو پائے گا۔

بشیر علی اور محمد نیاز محسن صدیقی کی بیٹھک سے نکلے تو دونوں کے دل ہلکے ہو چکے تھے۔

''مگر کھیتھری بازار کی ایک طوائف نے ہم پر چپل اٹھائی تھی۔ یہ بات بھی کوئی بھلانے والی ہے۔ ہم نے بھی ماں کا دودھ پیا ہے بشیر علی۔ اس حرامزادی سے بدلہ لینا ضروری ہے، ورنہ کسی دن چھاتی پر سوار ہو جائے گی۔

دونوں نے کچھ مشورے کئے اور ایک طرف کو نکل کھڑے ہوئے۔

عیش سرمدی لالٹین کی روشنی میں بیٹھا کسی غزل کی اصلاح کر رہا تھا۔ عیش سرمدی رباعی وقطعہ چار آنے کی فی نظم، غزل اور قطعۂ تاریخ وصال آٹھ آنے (قطعۂ تاریخ وصال کی اجرت مصلحتاً کم رکھی گئی تھی، تاکہ مرنے والے کے اعزاء مزید غم میں مبتلا ہونے کی زحمت سے بچے رہیں) اور فی سہرا وقصیدہ ایک روپے کے حساب سے تجارت کیا کرتا تھا (کیا حسب حال تخلص پایا تھا!) اور شہر کا نامی گرامی سخنور تصور کیا جاتا تھا۔

عیش سرمدی اتنی رات گئے ان لوگوں کو دیکھ کر بوکھلا سا گیا۔

بشیر علی نے جیب سے ایک چونی نکالتے ہوئے کہا "حضرت عیش سرمدی صاحب ہمیں ایک عدد قطعے کی سخت ضرورت ہے"۔

"میں تو قوم کا خادم ہوں۔ حکم کی دیر ہے"۔ چنانچہ عیش سرمدی نے عرضی نویسوں کے انداز میں مضمون دریافت کیا اور لکھنے بیٹھ گیا۔

سویرے جب محسن صدیقی کی آنکھ کھلی تو اس نے سنا کہ دروازے پر کوئی گرجدار آواز میں پکار رہا تھا۔

"محسن صدیقی صاحب تشریف رکھتے ہیں"۔

محسن صدیقی کو سخت حیرت ہوئی کہ یہ سویرے ہی سویرے کون آدھمکا۔ دروازہ کھولا تو ٹھیکیدار فضل کریم ہاتھ سے لکھا ہوا ایک بڑا پوسٹر لئے کھڑا تھا۔ چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔

"میں تو آپ کو شریف آدمی سمجھتا تھا"۔

"تو پھر اچانک کون سا حادثہ پیش آیا"۔

فضل کریم نے پوسٹر دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھئے یہ آپ کا کارنامہ ہے، آپ سمجھے ہوں گے کہ شاید میں ان خرافات سے گھبرا جاؤں گی۔ گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا لیکن جناب محسن صدیقی صاحب میں نے بہت زمانے دیکھے ہیں"۔

محسن صدیقی نے پوسٹر پر ایک نظر ڈالی

صلائے عام ہے......

سنو کہ سنگ بہ دیوار کہہ رہا ہے تمہیں

یہ اہتمام ہے ہر پیر اور جواں کے لئے
کہ حسن رقص میں ہے زندگی غزلخواں ہے،
دل حزیں کے لئے قلب ناتواں کے لئے
یہاں ٹھیٹھری بازار کی مشہور طوائفیں زلیخا، شبو اور مہہ جبیں رہتی ہیں۔
(نوٹ: ضرورت مند حضرات ٹھیکہ دار فضل کریم یا خان بہادر عظیم الدین سے رجوع کریں)

''عرض کیا قبلہ آپ نے معاملات کی چھان بین کئے بغیر یہ معاملہ میرے سر کیوں تھوپ دیا''۔ ٹھیکہ دار فضل کریم ایک ثانیے کے لئے کسی سوچ میں پڑ گیا۔

''مانا کہ میں آپ کا پڑوسی ہوں اور جن باتوں کی طرف اس پوسٹر میں اشارہ کیا گیا ہے ان سے بخوبی واقف ہوں، لیکن آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں اتنی گھٹیا حرکتوں پر اتر آؤں گا۔ میں تو اس سلسلے میں آپ سے براہ راست گفتگو کرنے والا تھا، یہ محض اتفاق ہے کہ آج آپ خود ہی تشریف لے آئے''۔

''آپ جو باتیں جانتے ہیں وہ اگر میرے علم میں بھی آجائیں تو شاید میں حالات کو سدھارنے کی کوشش کرتا''۔

''صورت حال یہ ہے چچا صاحب کہ یہ محلّہ جسے آپ میرن کی گلی کہتے ہیں، شریفوں کا محلّہ ہے۔ غربت اور افلاس کے باوجود ہم شریف اور عزت دار ہیں۔ چنانچہ اس محلے میں رنڈیوں کا اس طرح اڈہ قائم کرنا ہم سبھوں کو شاق گزرا ہے''۔

''لیکن اگر وہ میری بیوی ہو اور عزت دار عورتوں کی طرح رہتی ہو تو آپ لوگ کیا کر لیں گے۔ میری تو آپ لوگوں کو تعریف کرنی چاہئے کہ بقول

ع مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

''یہ تو محض شاعری ہے ورنہ حقیقت تو بہت ہی تلخ ہے''۔
''لیکن حقیقت کیا ہے میرے بھائی کچھ میں بھی سنوں''۔

''حقیقت سی آر اے ۳۰۲۱ ہے۔ سی آر پی ۳۸۴ ہے۔ وہسکی کی بوتلیں ہیں جو کارپوریشن کے ڈرم میں پڑی ملتی ہیں۔ بابو بجرنگ لال آڑھتیا ہے، روی شنکر ہے اور سب سے

بڑھ کر خان بہادر عظیم الدین ہے جو خود ایک حقیقت ہے اور کئی حقیقتوں کا پتہ دیتا ہے۔
"تو گویا میرا شبہہ صحیح تھا۔ سنئے محسن صدیقی صاحب آپ لوگ محض پرچھائیوں کے پیچھے بھاگنے والے لوگ ہیں۔ میں سرکاری ٹھیکیدار ہوں میرے یہاں انجینئر، آفیسر اور تاجر پیشہ لوگ آتے ہی رہتے ہیں، اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ محض ان لوگوں کے آنے سے کسی پر تہمت دھرنا، کسی کو بدنام کرنا کہاں کی انسانیت ہے۔ شراب کی بوتلیں کبھی نکل آتی ہوں گی۔ یہ افسروں کا طبقہ تو ان باتوں کے لئے کافی بدنام ہے۔ رہ گیا خان بہادر عظیم الدین تو شاید آپ کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ وہ میرے بچپن کا یار ہے۔ اسے، خان بہادر، کے نام سے میں ہی پکارتا تھا، حتیٰ کہ وہ سارے شہر میں اسی نام سے مشہور ہوگیا۔ چنانچہ وہ اگر میرے گھر آتا ہے تو یہ کوئی اہم بات نہیں ہوئی"۔ محسن صدیقی نے گھڑی کی طرف نظر دوڑائی دفتر کا وقت ہورہا تھا۔
"میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ بس ایک آخری بات اور کہنا ہے کہ بھائی آپ کے احباب لڑنا چاہتے ہیں تو شاید انہیں فضل کریم کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ میں شریفوں کے لئے بے حد شریف ہوں اور کمینوں کے لئے بے حد کمینہ ہوں"۔
"ٹھیکیدار صاحب"۔ محسن صدیقی نے کافی تیز ہوکر کہا۔ "اگر آپ کو یہاں رہنا ہے تو محلے والوں کے جذبات کا لحاظ کرنا سیکھئے۔ آپ کو پیسوں کا گھمنڈ ہے تو ہمیں اس چھوٹی سی دنیا کے رسم و رواج اور یہاں کی یکجہتی پر گھمنڈ ہے"۔

ٹھیکیدار کچھ تھم سا گیا۔ "اچھا تو ٹھیک ہے آپ جو چاہیں کرلیں"۔

وہاں سے نکل کر ٹھیکیدار نے حالات کا از سر نو جائزہ لیا۔

محلے میں، حافظ متین کی ذات بڑی غنیمت تھی۔ حافظ متین گوپی چند ہائی اسکول میں مدرس تھے اور نچلے درجوں میں اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھاتے تھے۔ آدمی کثیر الاولاد تھے۔ ڈیڑھ سو روپے کی تنخواہ پاتے تھے۔ اس پر متضاد یہ کہ انہوں نے اپنے اوپر دو گھروں کا خرچ ڈال لیا تھا۔ چار بچے پہلے گھر سے تھے اور پانچ بچے دوسرے گھر سے۔ گوپی چند ہائی اسکول گھر سے کوئی سات آٹھ میل دور تھا، اس لئے حافظ متین ۹ بجے دن ہی کو سائیکل لئے گھر سے نکل جاتے اور ۶، ۷ بجے شام سے پہلے گھر واپس نہیں لوٹتے۔ حافظ متین فرصت کے

اوقات میں گھر بیٹھے دونوں بیویوں کے درمیان صلح صفائی کراتے، بڑی بچی کی شادی کی فکر کیا کرتے اور دو بڑے بچوں کو جو اسکول کی اونچی جماعتوں میں پہنچ چکے تھے پڑھانے کی ناکام کوششیں کیا کرتے۔ ہاں ہفتے میں تین تین چار بار شام کے پہر ڈاکٹر گپتا کے مطب کے پھیرے لگانا بھی ان کے معمولات میں داخل تھا۔ ڈاکٹر گپتا میرن کی گلی کے مشہور ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے اور غریبوں کے لئے دو آنے فی خوراک کے حساب سے علاج کیا کرتے تھے۔

زندگی کی ریت پر رواں رواں کرتے ہوئے حافظ متین میرن کی گلی میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ محسن صدیقی انہیں اپنا بزرگ دوست سمجھتے تھے اور جب اتوار کو ان کی بیٹھک کھلتی تو محسن صدیقی، شاکر علی اور اسی قسم کے کئی دفتری لوگ ملنے آ جاتے۔ بات سیاست حاضرہ سے شروع ہوتی اور پھر دور بہت دور چلی جاتی۔ خلافت امویہ وعباسیہ۔ تاریخ کا زریں دور۔ اس کا زوال...... زوال...... زوال...... زوال۔

اور یوں حافظ متین جو ہفتے کے چھ دن اپنی ذات میں گم رہا کرتے تھے، اتوار کے دن اپنے ماضی اور اپنی تاریخ کی بربادیوں پر آٹھ آٹھ آنسو بہایا کرتے۔ کوئی علاج؟ کوئی علاج؟

پر انہیں تو شخصی زندگی اور اجتماعی زندگی دونوں لاعلاج سی دکھائی دیتی تھیں۔

ٹھیکیدار فضل کریم نے سوچا یہ مہرہ کام کا دکھائی دیتا ہے۔

رات کے نو بجے جب اس نے حافظ متین کے گھر پر آواز دی تو حافظ متین چارپائی پر پڑے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ "یا اللہ یہ اتنی رات گئے کون آ گیا"۔

بیٹھک کھول کر باہر نکلے تو ٹھیکیدار فضل کریم اور خان بہادر عظیم الدین سردی میں کھڑے "سوں سوں" کر رہے تھے۔

"ارے آپ لوگ، آیئے تشریف لایئے"۔

وہ دونوں بیٹھک میں آ گئے۔ ٹھیکیدار فضل کریم فوراً عرض مدعا پر آ گیا کہ بیٹھک کی کرسیاں تاریخ کے زوال پر روتے روتے اونگھ سی گئی تھیں۔

"آپ کو زحمت یوں دی حافظ صاحب کہ میں نے آپ کے محلے میں ننھے نواب والا مکان خریدا ہے، آپ شاید جانتے ہوں گے"۔

"اور شاید آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ محسن صدیقی کی قیادت میں ایک ہنگامہ کھڑا کیا جا

رہا ہے اور میری بیوی کو محلے سے نکالنے کی اسکیمیں بنائی جا رہی ہیں۔

"آپ جانتے ہیں ٹھیکیدار صاحب، میں غریب و نادار آدمی ہوں۔ صبح سے شام تک کولہو کے بیل کی طرح اپنے کاموں میں جتا رہتا ہوں۔ اس الجھی ہوئی زندگی میں مجھے تو کسی سے دو گھڑی بیٹھ کر بات کرنے کی بھی فرصت نہیں۔ ہاں بس ہفتے میں ایک دن اتوار کو دو ایک گھنٹوں کے لئے چند احباب، یہی محسن صدیقی، شاکر علی اور مولوی برکات وغیرہ آ جاتے ہیں"۔ حافظ متین نے سانس درست کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یاد آتا ہے کہ پچھلے اتوار کو کچھ ذکر آیا تھا آپ کا بھی۔ ویسے محسن صدیقی تو بڑا بھلا لڑکا ہے۔"

"صحبت برے لوگوں کی پائی ہے"۔ ٹھیکیدار فضل کریم نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "غرض کہ وہ لوگ مجھ پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ میں اس مکان میں رنڈیوں سے پیشہ کرواتا ہوں۔ مکان میں شراب کے دور چلتے ہیں اور گویا میں نے وہاں پوری ٹھیٹھری بازار آباد کر دی ہے"۔

"لیکن حقیقت کیا ہے؟"

"حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ میں نے ٹھیٹھری بازار کی مشہور طوائف زلیخا بائی سے نکاح پڑھوالیا ہے۔ زلیخا تائب ہو چکی ہے اور زندگی کے بقیہ دن صلوم وصلوۃ میں گزارنے کا ارادہ رکھتی ہے، لیکن قسمت ایسی کھوٹی پائی ہے کہ سارے محلے والے درپئے آزار ہیں"۔

"اگر یہ سچ ہے تو پھر ایسا کیجئے کہ آئندہ اتوار کو محلے کے کچھ منتخب لوگوں کو اپنے یہاں بلا لیجئے میں انہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا"۔

"بہت خوب میں ابھی سبھوں کو خبر کر دیتا ہوں"۔

دوسرے دن تڑکے ہی محسن صدیقی حافظ متین کے گھر پر پہنچ گیا۔ حافظ متین فجر کی نماز کے بعد تلاوت میں مشغول تھے۔ محسن صدیقی کی آواز سنی تو بیٹھک میں نکل آئے۔

علیک سلیک کے بعد محسن صدیقی نے سگریٹ کا ایک کش کھینچتے ہوئے سوال کیا "ٹھیکیدار آپ کے پاس بھی آیا تھا"۔

"ارے بھائی وہ تو پہلے میرے ہی پاس آیا تھا اور میں نے ہی اسے یہ رائے دی تھی کہ اپنے گھر پر کچھ مخصوص لوگوں کو بلا لو میں انہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

''مصیبت یہ ہے حافظ جی کہ دنیا آپ جیسے سیدھے سادھے لوگوں کے رہنے کی جگہ ہی نہیں ہے۔ ٹھیکیدار نے ایک چال چلی اور آپ اس کی چال میں آگئے۔ ہمارے پاس کمیشن کی رپورٹ ہے جو سرتاسر ٹھیکیدار کے خلاف ہے''۔

محسن صدیقی نے کمیشن کی رپورٹ سنائی۔ منظر و پس منظر دونوں ان کی نظر کے آگے تھے۔

''لیکن محسن میاں بات حسن وخوبی سے طے پا جائے تو اچھا ہے۔ بیکار کی ہنگامہ آرائی کا کیا حاصل اور جب وہ یہ کہتا ہے کہ زلیخا تائب ہو چکی ہے، تو کیوں نہ ہم اسے کچھ موقع دیں اور اس کے طور طریقے دیکھ لیں''۔

''زلیخا تائب ہو چکی ہے۔ ٹھیکیدار فضل کریم گناہوں سے توبہ کر کے تارک الدنیا ہو چکا ہے۔ کمال ہی کرتے ہیں حافظ جی''۔

اتوار کے دن ٹھیکیدار فضل کریم اور خاں بہادر عظیم الدین نے ایک بار پھر محلے میں گھوم گھوم کر لوگوں کو آنے کی تاکید کر دی۔

دری کے فرش پر خوبصورت سی جاجم بچھی تھی۔ مسند گاؤ تکیے لگے تھے۔ لوگ دھیرے دھیرے آنے لگے اور جب حافظ متین اپنی الجھی سی داڑھی کھجلاتے پہنچے تو ٹھیکیدار فضل کریم اور خان بہادر عظیم الدین نے بڑے ادب سے اسے صدر میں لا بیٹھایا۔ خاصدان میں تازہ گلوریاں رکھی تھیں۔ سگریٹوں کا ڈبہ، بیڑی کے بنڈل۔ غرض سبھی انتظام تھے۔ جب سب لوگ اکٹھے ہوگئے تو فضل کریم نے حافظ متین سے کہا۔ ''حافظ جی آپ اجازت دیں تو میں حاضرین کو اس میٹنگ کی غرض وغایت بتا دوں''۔

حافظ متین کی اجازت پر ٹھیکیدار فضل کریم بولنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''بھائیو یہاں ہندو اور مسلمان دونوں موجود ہیں۔ میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اگر ایک رنڈی اپنے گناہوں سے توبہ کرلے اور بقیہ زندگی خدا اور رسول کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کا فیصلہ کرلے تو کیا اس کے باوجود ہمارا سماج اسے قبول کرنے کو تیار نہیں ہے؟ قصہ یہ ہے کہ میں نے زلیخا بائی سے نکاح کیا ہے۔ یہ نکاح مولوی واعظ الحق صاحب نے پڑھایا ہے۔ آپ ان سے جا کر دریافت کر سکتے ہیں۔ لیکن عالم یہ ہے کہ آج

میرن کی گلی میں ہر کس و ناکس ہمارا دشمن ہے اور ہمیں محلے سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے"۔

فضل کریم نے اپنا بیان ختم بھی نہیں کیا تھا کہ خان بہادر نے صدر کی اجازت کے بغیر بولنا شروع کیا۔

"فضل کریم نے زلیخا بائی سے نکاح پڑھا لیا ہے۔ مجھ سے ایک دن بشیر علی نے دریافت کیا کہ میں اس مکان میں کیوں آتا جاتا ہوں۔ میں اگلے وقتوں کا سیدھا سادھا آدمی، بشیر علی کے جھانسے میں آ گیا اور میں نے بتا دیا کہ ٹھیکیدار فضل کریم نے ٹھیٹھری بازار کی زلیخا بائی سے نکاح کر لیا ہے اور وہ یہاں اپنی بھانجی مہ جبیں اور مظفر پور کی ایک یتیم لڑکی شبو کے ساتھ رہتی ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ میں نے بشیر علی کو یہ سب کچھ بتا کر گویا ایک بڑے طوفان کو دعوت دی ہے۔ میں نے بشیر علی سے یہ بھی کہا تھا کہ ٹھیٹھری بازار کو تو کہیں نہ کہیں آباد ہونا ہے، خواہ وہ میرن کی گلی میں آباد ہو یا .."۔

حافظ متین نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "عظیم الدین صاحب آپ بیٹھ جائیں۔ ہم لوگ اس وقت یہ سوچنے کو اکٹھا نہیں ہوئے ہیں کہ ٹھیٹھری بازار کو کہاں آباد ہونا چاہئے"۔

حافظ متین ایک لمحے کے لئے رک گیا۔ "بھائیو ٹھیکیدار فضل کریم نے زلیخا بائی سے نکاح پڑھایا ہے، یہ سو فیصدی صحیح ہے اور جیسا کہ وہ کہتے ہیں وہ تائب ہو چکی ہے اور زندگی کے بقیہ دن صوم وصلوٰۃ میں گزارنا چاہتی ہے۔ اگر اسکے نامۂ اعمال میں سدھرنا ہی لکھا تھا تو ہمیں اس کا دکھ کیوں ہو۔ بقیہ رہی یہ بات کہ اس گھر میں انجینئر اور سرکاری آفیسر آتے ہیں اور شراب کے دور چلتے ہیں، تو اس سلسلے میں میں نے ٹھیکیدار صاحب سے دریافت کیا تھا اور انہوں نے جواب دیا کہ وہ ان سے کاروباری سلسلوں سے ملنے آتے ہیں۔ انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ایک آدھ بار ان کے یہاں خان بہادر عظیم الدین کی صحبت میں شراب کے دور چلے تھے لیکن آئندہ سے وہ ان باتوں کا خیال رکھیں گے۔ چنانچہ ان کی ان وضاحتوں سے میری تشفی ہو گئی۔ ویسے اگر ان کی صفائی کے باوجود آپ شک وشبہ میں گرفتار ہیں تو ان سے ان باتوں کی مزید تحقیق میں کیا مضائقہ ہے"۔

خورجہ کے محمد احمد خاں نے اونچی آواز میں کہا۔ "حافظ متین آپ ٹھہرے اللہ کے نیک

بندے آپ ان شاطرانہ چالوں کو کیا سمجھیں"۔

فضل کریم نے احتجاج بلند کرتے ہوئے کہا۔ "حافظ جی آپ مقرر حضرات سے کہہ دیں کہ وہ اپنے لب و لہجے کو درست رکھیں"۔

حافظ متین نے جواب دیا۔ "صحیح فرمایا آپ نے۔ آپ حضرات لہجے میں متانت اور سنجیدگی برقرار رکھنے کی کوشش کریں"۔

محسن صدیقی نے کھنکھارتے ہوئے صدر کی اجازت حاصل کی۔ "یہ تائب ہونے کا شوشہ چھوڑ کر ٹھیکیدار فضل کریم صاحب نے جنہیں کل تک میں اپنا بزرگ سمجھتا تھا اور آج محض ٹھیکیدار فضل کریم سمجھتا ہوں، حافظ متین صاحب کو ایک بڑی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اگر زلیخا بی واقعی تائب ہو جاتی تو کیا ہمیں پاگل کتے نے کاٹا تھا کہ ہم اس کے پیچھے یوں بھونکتے پھرتے۔ حافظ جی یہاں تو مہ جبیں اور شبو سے باضابطہ پیشہ کرایا جا رہا ہے۔ انہیں انجینئروں اور آفیسروں سے یہاں پیش کیا جاتا ہے کہ اس بساط عالم پر عورت ایک ایسا مہرہ ہے جو بڑی سے بڑی بازی جیت لے جاتا ہے۔ یہاں سرائے گنج کا مشہور آڑھتیا بابو بجرنگ لال آتا ہے۔ اور شنکر کا لڑکا روی شنکر شبو سے ساز باز بڑھا رہا ہے"۔

اور فضل کریم نے گرجتے ہوئے کہا۔ "ثبوت"۔

"ثبوت ہم دے سکتے ہیں ٹھیکیدار صاحب۔" بشیر علی اور محمد نیاز نے زوردار ہانک لگائی۔

"ہم نے اس جگہ سے بابو بجرنگ لال کو آدھی رات گئے نشے میں دھت نکلتے دیکھا ہے۔ ہم نے روی شنکر سے ڈرا کر اس کی ایک چٹھی حاصل کی ہے جو اس نے شبو کو لکھی تھی اور وہ یہ ہے"

"اور یہ وہسکی کی دو بوتلیں ہیں جو ہم نے کارپوریشن کے ڈرم سے نکالی تھیں"۔ محمد نیاز نے وہسکی کی دو خالی بوتلیں جھولے سے نکالتے ہوئے کہا۔

"اور اگر آپ کہیں تو میں اس رکشے والے کو بھی بلا سکتا ہوں جو اکثر بابو بجرنگ لال کو یہاں سے واپس لے گیا ہے"۔

"آپ اور آپ کا وہ وفادار ازلی یہاں ٹھیکری بازار آباد کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہ کبھی

نہیں ہوگا۔کبھی نہیں ہوگا''۔بشیر علی آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

اور یکا یک زلیخا چیختی چلاتی، طوفانوں سے کھیلتی، کمرے سے نکل کھڑی ہوئی۔

''میں زلیخا بائی ٹھیٹھری بازار کی ایک ادنیٰ طوائف تمہارے درمیان سے چلی جائے گی، میں چلی جائے گی۔لیکن تم ٹھیٹھری بازار سے کب تک دامن بچاؤ گے۔ٹھیٹھری بازار تو تمہارے اردگرد آباد ہے۔تمہارے دلوں میں آباد ہے۔بتاؤ بتاؤ''۔

مجلس پر ایک سناٹا طاری تھا۔حافظ متین صدر سے اُٹھ کر سر جھکائے گھر واپس جارہے تھے۔

خاصدان میں تازہ گلوریاں اب بھی ویسے ہی پڑی تھیں۔بھرا ہوا سگریٹ کا ڈبہ، بیڑی کے بنڈل۔

میرن کی گلی میں ٹھیکیدار فضل کریم کے نئے کرائے دار شانتی کمار بوس کے بڑے چرچے تھے۔بوس بابو خوش اخلاق آدمی تھے اور ان کی مسکراہٹیں جیسے پوری پوری داستان سنادیا کرتی تھیں۔

''کی ہولو صدیقی صاحب''۔

اور محسن صدیقی جو اپنی بیٹھک کو ہرگز اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ شانتی کمار بوس جیسا معزز اور ذی حیثیت آدمی اس میں بیٹھ سکے، کھسیانی سی ہنسی ہنس کر کہتا۔

''سب ٹھیک ہے بوس بابو، آیئے بیٹھئے''۔

ایک دن باتوں ہی باتوں میں بوس بابو نے بتایا کہ وہ ٹالی گنج کلکتے کی کچھ جائداد بیچ کر یہاں عنقریب دوا سازی کے لئے ایک بڑا کارخانہ کھولنا چاہتے ہیں۔چنانچہ ایک اتوار کو محسن صدیقی کے ساتھ وہ کسی مناسب جگہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ایک جگہ ایک بڑا سا پلاٹ ان کی نظر میں جچ گیا اور یہ طے پایا کہ کلکتے والی جائداد کے بکتے ہی اس زمین کی خریداری کے سلسلے میں بات چیت شروع کردی جائے گی۔

غرض کہ کلکتے کے بوس بابو میرن کی گلی میں ایک فال نیک سمجھے جانے لگے۔اگر دوا کا کارخانہ کھل گیا تو کتنے ہی بندگان خدا کا بھلا ہوگا۔

بوس بابو کے پاس نوکریوں کے لئے بڑی بڑی سفارشیں آنے لگیں اور انہیں دیکھ کر

بوس بابو مسکراتے ہوئے کہتے۔ ''صدیقی صاحب سلیکشن تو آپ کریں گے آپ یہاں کے لوکل آدمی ہیں۔ میں یہاں کے لوگوں کو کیا جانوں ''۔

محلے والے سوچتے اتنا بڑا آدمی ہے لیکن طبیعت کیسی سادہ پائی ہے۔

پر ایک دن جب بوس بابو کہیں باہر گئے ہوئے تھے تو شاکر علی نے کامن روم میں آکر ایک سنسنی خیز انکشاف کیا۔

آج ہی میں نے کلکتے والے ڈاکٹر مجمدار سے سنا ہے۔ سبھوں کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوگئی۔

وہاں بوس بابو بھی اکثر آتے جاتے ہیں۔ آج جب وہ اٹھ کر چلے گئے اور میں نے ان کی خوش اخلاقی اور انسان دوستی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ عنقریب ایک بڑی تجارت میں سرمایہ لگانا چاہتے ہیں تو ڈاکٹر مجمدار نے ہنستے ہوئے کہا ''تجارت تو مسٹر علی ان کے یہاں پشتوں سے ہوتی آرہی ہے''۔

''کس چیز کی تجارت؟'' میں نے سوال کیا

اور اس پر ڈاکٹر مجمدار ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔

''وہ پرائیویٹ تجارت ہے''۔

جیسے سبھوں کے چہرے سوال کر رہے تھے۔ اب کون سا راستہ ہے؟ اب کون سا راستہ ہے !!

اور یکایک انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے زلیخا چیخ چیخ کر کہہ رہی ہو

''تم ٹھیکری بازار سے کب تک دامن بچاؤ گے۔ ٹھیکری بازار تو تمہارے اردگرد آباد ہے تمہارے دلوں میں آباد ہے۔ بتاؤ . بتاؤ .... ۔

(یہ ناولٹ ۱۹۶۰ء کی تحریر کردہ ہے۔ اس وقت کلکتہ کو لکاتا نہیں کہا جاتا تھا۔)

☆☆

گناہ آدم

آج شام ہی سے بجلی کے قمقمے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ وہ مدھم اور مدھم اور مدھم ہو جاتے۔ پھر ایک مہیب اندھیرا ہر شئے کو اپنی ذات میں گم کر لیتا اور جب اچانک روشنی لوٹ آتی تو آنکھیں جھپک جھپک سی جاتیں۔ روشنی جاتے وقت ایک شور ایک احتجاج سا بلند ہوتا لیکن رفتہ رفتہ یہ آوازیں ایک کربناک خاموشی میں بدل جاتیں۔ ہاں جب روشنی آ جاتی تو پھر ایک شور سا اٹھتا لیکن اس شور میں اندھیرے کے جانے کی خوشی صاف جھلک جاتی تھی۔ دوکانوں پر موم بتی کی قیمت بڑھ گئی تھی اور کہیں کہیں دیا سلائی کے لئے بھی ایک نیا پیسہ زیادہ دینا پڑتا تھا۔ بجلی کمپنی والے جنریٹر کے بگڑ جانے سے پریشان تھے اور شہریوں سے معذرت کرتے کرتے تنگ آ چکے تھے۔

سید صاحب جن کے ماتھے پر وقت نے کتنے ہی نشانات ثبت کر دیے تھے۔ اس اندھیرے اور اجالے کی عملداری کے وقفے میں اپنے ڈھلتے وجود کو آرام کرسی میں دھنسائے طوفانوں سے کھیل رہے تھے۔ ان کے سر کی چاندی اندھیرے میں بھی چمک چمک جاتی تھی۔

"بڑے صاحب اب میں یہاں ایک سیکنڈ رہنا نہیں چاہتا۔ میں اب اپنے شہر واپس چلا جاؤں گا"۔ تازہ چائے نے منیر اور اس کے باپ کو تازہ حرارت بخش دی تھی۔ منیر کی قمیص کے اوپر والی جیب سے اکلوتی سگریٹ کے خدوخال پھوٹے پڑ رہے تھے۔ بار بار کوئی غیر مرئی طاقت اس کا ہاتھ اس کی جیب تک لے جاتی لیکن وہ جھٹکے کے ساتھ اسے کھینچ لیتا۔

"لیکن تمہارا شہر کون ہے؟" اور ظہیر نے تنفر آمیز لہجے میں 'ہونھ' کہا۔

تمہارا شہر کون ہے؟ کون ہے کے آگے ایک بڑا سوالیہ نشان بن گیا۔

کوئی آواز دے رہا تھا۔ ’’سید صاحب ہیں‘‘۔

یہ سوکھی سہمی آواز کس کی ہوسکتی تھی۔ سید صاحب بخوبی جانتے تھے اس لئے انہوں نے اندر ہی سے ہانک لگائی۔

’’کہو ظہیر کیا بات ہے‘‘۔

’’ابا جان آپ کو......‘‘۔

’’نصیر صاحب کو وہی پرانا دفتری معاملہ درپیش ہوگا‘‘۔

اسے اکیلا چھوڑ کر سید صاحب ہولے ہولے زینوں پر چڑھتے گئے۔ مسجد کے صحن پر دھوپ نے طنابیں کھینچ دی تھیں۔ حافظ ابوالحسن بچوں کو لے کر مسجد کے اندر چلے گئے تھے۔ دوسری طرف مولوی سلم اللہ قاعدہ بغدادی پڑھا رہے تھے۔ سید صاحب کی تیز چیخ گنبد و مینار اور در و دیوار سے اترتی ہوئی اس کوٹھری میں جا پہنچی جہاں نصیر صاحب نے تھک ہار کر آخری پناہ لی تھی۔ حوض کا نل کھلا تھا، انہوں نے اسے بند کیا اور جوتیاں اتار کر صحن سے ہوتے ہوئے نصیر صاحب کی جانب لپک پڑے۔

آہٹ سن کر نصیر صاحب کمر سنبھالتے ہوئے چارپائی پر اٹھ بیٹھے۔ وہ اور ان کی چارپائی جیسے دونوں زمانے کی بے التفاتی کا شکار تھے۔

’’سید بھائی یہ دن اور میرے ناز دیکھو‘‘۔ سید صاحب نے گلے سے لگالیا۔ ’’مسخرے پاسپورٹ تو میرا ابھی تیار ہے‘‘۔

پھر وہی دفتر کھل گیا۔ زندگی کی تلخ کامیاں۔ محرم میاں۔ وہ جوانی ہوتے ہوئے بھی اپنی نہ ہوسکی اور یہ خدائی خوار اپنی بے وفاماں کی اکلوتی نشانی۔

اور بات وہی تھی جو عموماً ہوا کرتی تھی کہ قبلہ ظہیر صاحب کی اک ذرا غفلت سے نصیر صاحب کو پچھلی شام اچھی تازی نہ مل سکی تھی۔

’’کما ہے، بخت لاخیرا ہے۔ سینکڑوں بار کہہ چکا ہوں۔ سید صاحب کہ دھنو پاسی کے یہاں سے تازی لایا کرو۔ میرے اس کے چالیس سال کے مراسم ہیں۔ چالیس سال کے‘‘۔

لیکن عرش سے فرش پر آنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی۔

''تو آپ کے مزاج کیسے ہیں۔ سید صاحب'' اور پھر وہ اگالدان کھینچتے ہوئے بولے ''بیٹا ظہرو چچا کے لئے حقہ تو بھر دے اور اب مطلع صاف ہو چکا تھا۔

''کیا کہوں سید صاحب اگر اسے اسی عالم میں چھوڑ کر چلا گیا تو میری تو قبر میں بیٹھ نہیں لگے گی۔ میرا کیا ہے بقول میر۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے

یہ بندۂ کمینہ ہمسایہ ہے خدا کا

سید صاحب نے ایک اچٹتی سی نگاہ کوٹھری پر ڈالی۔ کونے میں کچھ تام چینی کے برتن تھے۔ ایک سرد پڑی انگیٹھی، دیوار سے لگی الگنی جس پر ٹھنڈے اور گرم کپڑے اچھے اور برے دنوں کی صد ہا داستانیں جیب و گریباں میں چھپائے پڑے تھے۔

سید صاحب نے سوچا کہ اگر ذرا بھی ان کپڑوں کو چھیڑا گیا تو مچھروں کی وہ یورش شروع ہوگی کہ ...... یہی نگاہیں تھیں جنہوں نے کبھی نصیر منزل، کی قلعہ نما عمارت بھی دیکھی تھی۔ سنگ و آہن جیسی مضبوط۔ وہاں رات کو دن کا سماں تھا، ایک حکومت کا جاہ و جلال تھا۔

اور اب ایک انفعالیت کے عالم میں نگاہیں واپس آ چکی تھیں۔ حقہ تیار ہو چکا تھا۔ دل کے ویرانے سے ایک آواز آئی۔

سید بھائی تنفس جان لئے لے رہا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں لرزہ ہے۔ بس ایک آنکھوں میں دم ہے۔ مرزا نے جیسے میرے ہی لئے وہ شعر کہا تھا۔

سید صاحب کی نظروں کے آگے نواب نصیر تھے جو نصیر منزل سے اتر کر اس کوٹھری میں آ بسے تھے۔ مگر متانت اور سنجیدگی سے آج بھی اللہ واسطے کا بیر تھا۔

ظہیر نے باپ سے کچھ اردو فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں۔ اس نحیف و زار اور مغموم صورت لڑکے نے نصیر صاحب کے احباب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ آخر یہ کمزور سا لڑکا کیا کرے گا۔ کوئی کسی کی زندگی دیکھ کر نہیں آیا۔ اور یہ کرے گا بھی کیا۔ لیکن وہاں تو قبر میں پیٹھ لگنے والی بات تھی۔

میر وحید حسن نے خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا ''لڑکا تو سیدھا ہے، شریف گھرانے کا ہے، تو پھر اسے کل ہی سے آنے کے لئے کہہ دو'' ۔ میر وحید حسن بدر گنج کے رئیس تھے۔ چھوٹی سی

تحصیل تھی۔ ان کے بزرگوں نے بٹیریں لڑائی ہوں گی۔ مینڈھے لڑائے ہوں گے۔ لیکن وہ مقدمے لڑایا کرتے تھے اور شہر میں میر وحید حسن قانونی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ بیوی کا کوئی سال بھر پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ مرحومہ نے دو یادگاریں چھوڑی تھیں۔ ایک لڑکی جو کوئی پندرہ سولہ سال کی تھی اور ایک لڑکا جو تقریباً آٹھ نو سال کا تھا۔ اس لڑکے کے لئے کچھ دنوں تک میر صاحب کو ایک ایسے معلم کی ضرورت تھی جو معمر ہو اور جس کی نگاہیں روزن و در کا تعاقب نہ کرتی ہوں۔ عمر والی قید پر میاں ظہیر کہاں پورے اترتے لیکن سید صاحب سے میر صاحب کے کچھ ایسے تعلقات تھے کہ ان کی بات اٹھانا ان کی نسل کے لوگوں کے لئے ممکن نہیں تھا اور پھر میاں ظہیر نصیر صاحب کے چشم و چراغ تھے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

میر صاحب کی حویلی کیا تھی۔ اک شہر خموشاں تھا، جہاں دو کمسن مجاور رہا کرتے تھے۔

اور جہاں سر شام ایک بوڑھا مجاور چراغ جلانے چلا جایا کرتا تھا اور صبح دم اپنی دنیا میں لوٹ جاتا تھا۔ ایک ماما دو چار گھڑی کے لئے آجایا کرتی تھی۔ دن بھر میں ایک ہی ہانڈی پکتی تھی، جو ماما پکا کر چلی جاتی تھی اور پھر کیا ہوتا تھا۔ ظہیر نے بس اتنا ہی محسوس کیا کہ زنانخانے کی ان حدوں کے اندر کبھی کبھی کوئی دھڑکن فضا کو چونکا دیتی تھی۔ ظہیر کے ذہن پر اس کے افکار پر اس کے کردار و گفتار پر، غرض ہر جگہ نصیر صاحب نے ایسی چوکیاں بٹھا دی تھیں کہ ظہیر کو اس قید و بند سے نکل بھاگنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ باہر کے کمرے میں تخت پر فرش بچھا تھا۔ لڑکا اردو کی تیسری اور فارسی کی پہلی کتاب پڑھتا تھا۔ کمرے میں جا بجا وصلیاں اور مشاہیر کی تصویریں ٹنگی تھیں۔

لیکن لمحہ بہ لمحہ ایک غیر معمولی سا تغیر بے پاؤں آرہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے نصیر صاحب کے پہرے ڈھیلے پڑ گئے ہوں۔ جیسے ذہن نے بغاوت کر دی ہو، کیونکہ مشاہیر کی تصویریں دیکھتے دیکھتے جانے کہاں سے ایک تصویر اور بھی ابھر آتی تھی۔ دھندلی دھندلی سی مبہم مبہم سی۔ اس تصویر کی جانب دیکھنے سے وہ بار بار احتراز کرتا تھا لیکن بار بار اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ دریا کی سیر کرنے نکلا ہوا ہو، بلند موجوں کا خرام۔ دور بہت دور دریا کے قدم چومتا ہوا افق۔ بدمست سی ہواؤں کا لمس جو سطح آب پر بھی اسی طرح اٹکھیلیاں کرتی ہیں۔ کنارے کھڑی ہری فصلیں کہ اتنے میں اسٹیمر کا وسل بجے اور وہ ان چیزوں سے منہ موڑ کر اسٹیمر کی جانب

دیکھنے لگ جائے۔ یا خدا یہ سیٹیاں کیوں بجتی ہیں۔

اور پھر تصور کی دنیا میں تو اس دن بھونچال ہی آ گیا۔ شہیر کسی بہانے سے اٹھا اور گلی میں جا کر لڑکیوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا۔ ظہیر سوچتا اس نے بھی اس عمر میں یہی حرکتیں کی تھیں۔ آخر سن کے ہی تو تقاضے ہوتے ہیں کہ جالیوں سے ایک تو ڑا مروڑا کاغذ اس کے پاؤں پر آ گرا۔ جس پر ایک 'آداب'، ایک اکلوتی تحریر 'آداب' چمک رہی تھی۔

اور سچ تو یہ ہے کہ یہی وہ آداب تھا جس نے اسے آدب جنوں سکھایا۔ تصویر میں آپ سے آپ رنگ بھرنے لگے۔ ظہیر کو ایسا محسوس ہوتا جیسے دل کی کھیتی میں بڑی شادابی آ گئی ہے۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہے۔ تصویر کے خدوخال واضح ہوتے گئے۔ واضح اور واضح اور واضح۔

اس دن تو دونوں نے شہیر کے حق میں خوب خوب دعائیں کیں جب اسے پتنگوں کے مقابلے میں جانے کے لئے ظہیر سے دو گھنٹے کی چھٹی لی تھی۔

آج خوابوں نے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا اور ظہیر سوچ رہا تھا کہ آخر تصور نے کبھی اتنی اونچی چھلانگ کیوں نہیں لگائی تھی۔ حدیں یونہی نہیں کھینچی جاتی ہیں۔ خاموشی کی زبان نے کہا۔ جل پری تو تو میرے تصور سے بھی زیادہ حسین ہے۔ سبک، نرم و نازک، وہ جسے نصیر صاحب جیسا سخت گیر باپ ملا ہو، جس نے زندگی کے اٹھارہ سال بے آب و گیاہ ریگ زاروں میں گزارے ہوں اس کی نگاہوں کو خیرہ کرنے کے لئے یہ منظر بہت کافی تھا۔

''آپ کو میں نے ...''

''تو کیا تم نے اس روزن و در سے پرے کوئی دھڑکن نہیں سنی تھی''۔

یہ نامکمل سے ملاقات جس نے بہت سے دروازے کھول دیئے تھے نامکمل ہونے کے باوجود مکمل تھی۔ پھر یہ مختصر سا لمحہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا۔ شہیر کے بڑے مزے تھے، کتاب کھلی رہتی، ماسٹر صاحب بیٹھے رہتے اور وہ۔ اس کے لئے تو بس یہی کافی تھا کہ اس نے آدم و حوا کے قصے پڑھ لئے تھے۔ ظہیر تھوڑی دیر شہیر کو کچھ پڑھا دیتا اور پھر اسے آزاد کر دیتا کیوں کہ دوسری طرف بھی کوئی پرندہ آزادی حاصل کرنے کے لئے اپنے بال و پر تولنے لگتا۔

فاصلے کم ہوتے گئے۔ کم ہوتے گئے۔ سیاہ گھٹائیں۔ آنکھوں کے شراب خانے۔ عارض کے گلاب اور پھر جب یہ ساری منزلیں طے ہو گئیں تو ایک دن، ایک دن سرکش موجوں

کو سکون سا مل گیا۔ بے قراریوں کو قرار آ گیا۔ لیکن اس میں خرابی یہ تھی کہ یہ قرار نہیں محض عارضی دکھائی دیا۔

''تو عرض یہ ہے جناب عالی کہ ایک منزل ایسی بھی آتی ہے کہ آدمی ایک انگنائی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے''۔ اور فوجداری کے مشہور وکیل وسیع حسن صاحب نے سگریٹ کا آخری کش کھینچتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے تم یہاں اپنا گھر بسا سکتے ہو''۔ انہوں نے انیکسی کی طرف اشارہ کر کے کہا جہاں دو کمرے ایک عرصے سے خالی پڑے تھے۔ وکیل صاحب جوانی کی حدوں سے نکل چکے تھے۔

ظہیر کو اس دن بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ کامرانی اور فتح مندی کا نشہ سارے نشوں پر بھاری ہوتا ہے۔ تاڑی کے جشن میں اس نے بھی ایک آدھ بار نواب نصیر سے چوری چھپے حصہ لیا تھا لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہاں محض خود فراموشی کی ایک عارضی کیفیت تھی اور اس کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔ لیکن یہ نشہ تو بقول شخصے ''چیزے دیگر است''۔

نصیر صاحب نے محسوس کیا کہ لڑکے کے تیور اچھے نہیں ہیں۔ وہ جو آنکھوں کی معصومیت تھی، وہ جو چہرے کا بھولا پن تھا۔ اب گویا بھولی بسری کہانی بن چکا تھا۔ اب تو عالم یہ تھا کہ آنکھوں میں ایک سرکشی سی چمک تھی۔ چہرے پر یقین و اعتماد کی جھلکیاں تھیں۔ مولوی نصیر نے طوفانوں کے آگے جھکنا ہی سیکھا تھا۔ ان کی زندگی میں جب بھی طوفان آئے انہوں نے سپر ڈالنے ہی میں مصلحت سمجھی اور یوں جب ظہیر نے سر کھجلاتے اور کھنکارتے ہوئے (کہ یہ طریقے مولوی نصیر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے تھے) نصیر صاحب سے کہا کہ ''ابا جان میں وسیع حسن کی انیکسی میں جا رہا ہوں'' تو مولوی نصیر نے گویا چونکتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے''۔

''میں دونوں وقت آپ کے پاس آجایا کروں گا''۔

کوئی اور وقت ہوتا تو مولوی نصیر خود ایک طوفان بن جاتے۔ لیکن جس نے زندگی کی ۶۰ منزلیں تجربوں کی آندھیوں میں گزاری ہوں وہ اتنی بات تو سمجھتا ہی تھا کہ آخر ظہیر کے لہجے میں یہ تیقن۔ یہ اعتماد، یہ گمبھیر تا رات کی رات کیوں کر آ گئی۔ ضرور کوئی انقلاب۔ کوئی انقلاب۔

اور انقلاب تو اس وقت آیا جب میر وحید حسن نے کچہری سے واپسی پر پنجرے کو خالی دیکھا جیسے مکان کی پرانی شہتیریں، پرانی کڑیاں جنہوں نے کبھی ان کے اسلاف کا ساتھ دیا تھا، جو ہمیشہ دکھ سکھ میں ان کی شریک رہی تھیں۔ ان کی آن میں ان پر آ گری ہوں۔ دیواریں الٹ گئی ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک عمارت، ایک عظیم عمارت منہدم ہوگئی ہو۔ میر وحید حسن سناٹے میں کھڑے تھے اور ان کے برابر شہیر کھڑا بسور رہا تھا۔ آدم وحوا۔ آدم وحوا۔

''لیکن یہ کب اور کس کے ساتھ''۔

اور تب شہیر نے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں وہ باتیں بتائیں جنہیں اس نے بند کواڑوں کے سوراخ سے دیکھا تھا اور یہ کہ علی بابا کو سم سم کا راز خود خزانے ہی نے بتایا تھا۔ بالآخر آج دن کے بارہ بجے ایک رکشا دروازے پر آ کر رکا اور آپا یہ کہہ کر ماسٹر صاحب کے ساتھ چلی گئیں کہ ہم لوگ ابھی آتے ہیں۔

ایک زوردار تھپڑ پڑا۔ ''حرامزادے یہ سب پہلے کیوں نہیں بتایا تھا''۔ اور تب شہیر کو معلوم ہوا کہ واقعی کوئی بڑی بھول ہوگئی۔ کیونکہ تجربے نے اسے بتایا تھا کہ میر وحید حسن نے کبھی بلا وجہ اس کی خبر نہیں لی تھی۔ لیکن شہیر ان پیچ در پیچ معاملات کو سمجھنے سے یکسر قاصر تھا۔ آدم وحوا کی کہانی بڑی تفصیل طلب تھی اور شہیر تو ابھی شجر ممنوعہ کے سبق سے آگے نہیں بڑھا تھا۔

میر وحید حسن اکثر شہیر کو ٹہلانے لے جایا کرتے تھے۔ آج بھی وہ اس کا ہاتھ تھامے لئے جا رہے تھے۔ اب یہی ہاتھ تھے، جن سے انہیں کچھ توقع تھی۔ جو آنے والے دنوں میں انہیں سہارا دیں گے۔ جو انہیں قبر کی تنہائیوں میں ۔

آج وہ خود کو معمول سے زیادہ خوش دکھانے کی کوشش کر رہے تھے پھر بھی نظروں کے تیر اور اٹھتے ہاتھوں کی تلواریں براہ راست ان کے سینہ پر وار کر رہی تھیں۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ سامنے والے سے صاف صاف کہہ دیں کہ بھئی یہ علیک سلیک کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو۔

چہرے پر متانت کی دبیز نقاب ڈالے میر وحید حسن گلیوں اور کوچوں سے ہوتے ہوئے سڑک پر آ چکے تھے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ سب کچھ پہلے جیسا ہی ہو۔ سب کچھ پہلے ہی جیسا ہو۔ شہیر نے ایک جگہ ٹھہر کر کہا ''رکشا ادھر ہی کو مڑا تھا''۔ میر صاحب ادھر ہی کو مڑنے کو سوچ

رہے تھے کہ انہیں خیال آیا کہ کیوں نہ نصیر صاحب ہی کی خبر لے لیں۔

نصیر صاحب نے ظہیر سے آخری ملاقات کا حال بتایا۔

''اور سچ پوچھئے تو میر صاحب طوفانوں کو روکنے کی صلاحیت نہ ہم میں ہے نہ آپ میں ہے''۔ میر صاحب پیچ وتاب کھا کر رہ گئے۔ آخر یہ بات کیا ہوئی۔ زندگی میں انہوں نے اس نوعیت کے کتنے ہی مقدمے لڑے تھے۔ لیکن آج جب اس مقدمے نے خود ان سے مقابلے کی ٹھانی تھی تو ان کی عقل گم تھی۔

میاں نصیر بھی کیا کر سکتے تھے، ہر چیز اپنی اصلیت پر جاتی ہے۔ دل کے بہلانے کے یہی طریقے ہو سکتے تھے۔ لیکن اس ناشدنی کو کچھ سوچنا چاہئے تھا۔ شہر میں ایک میں ہی نہیں تھا اور اچانک انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا ''نصیر صاحب آپ دونوں باپ بیٹے نے جس طرح میری پگڑی اچھالی ہے خدا چاہے گا تو آپ کی پگڑی بھی اچھالی جائے گی۔ لیکن آپ کا کیا ہے آپ ٹھہرے ''۔ اور اس کے آگے میر وحید حسن کچھ نہیں کہہ سکے۔ انہیں، اخلاص اور مروت کے سبق یاد آ گئے یا ممکن ہے۔ انہیں مناسب الفاظ ہی نہ ملے ہوں پھر وہ اسی رخ پر روانہ ہو گئے۔ سڑک اور گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک جگہ انہیں ظہیر کی جھلک دکھائی دی۔

میر صاحب نے زوردار ہانک لگائی۔ ''ظہیر!''

ظہیر کے پاؤں میں جیسے بیڑیاں پڑ گئیں۔ اس نے بھاگنے کی کوشش بھی نہ کی۔ وہ تو اقبالی مجرم کی طرح ٹھٹک سا گیا۔ یہ وہ موقع تھا کہ میر وحید حسن بھی چکرا گئے۔ جب مجرم اتنا ڈھیٹ ہو تو

ظہیر میں اتنی اخلاقی جرأت کہاں تھی۔ اس کی جرأت اور صلاحیتوں کو تو نصیر میاں کی کڑی نگاہیں اور ان کے مسلسل پہرے نیست و نابود کر چکے تھے لیکن یہ جو کچھ ہو رہا تھا گویا آپ سے آپ ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے اس کی باگ سنبھال لی تھی جیسے کسی نے اسے طوفانوں سے مقابلہ کرنے کی عارضی ہمت دے دی تھی۔

اور اب میر وحید حسن کے مقابلے میں منہ زور موجیں تھیں۔ سرکش و بیباک۔ انہیں جوتوں سے نہیں حکمت عملی سے سر کرنا چاہئے۔ انہوں نے اشاروں کی زبان میں سوال کیا۔

''ظہیر و تم بربادیوں کے ڈھیر پر نئی عمارت کھڑی کر سکتے ہو''۔

''جی یہ سب کچھ ثریا کے ہاتھ میں ہے''۔

میر وحید حسن مجبوریوں کی قبا میں جسم و جان چرائے'' ظہرو کے کمرے پر پہونچے تو ثریا چونک سی گئی۔ اسے خیال تھا کہ میر وحید حسن اس کے حق میں دعائے مغفرت کر چکے ہوں گے لیکن میر صاحب کے دل میں تو محبت و شفقت کی جوالا پھوٹ رہی تھی۔ انہوں نے بیٹی سے بس اتنا ہی کہا۔ ''حویلی میں ہم تم اور شہیر رہتے تھے۔ تمہیں میرا خیال نہیں تھا تو شہیر کا خیال کرتیں اور اگر شہیر کا بھی خیال نہ تھا تو حویلی کا خیال کرتیں۔ حویلی ایک تاریخ، ایک ماضی ایک عہد کی علامت تھی۔''

شیبو نے اپنی جٹائیں کھول دیں۔

میر وحید حسن پگھل سے گئے لیکن وہ جو دوسری موج میں مدغم ہو چکی تھی، زندگی کے ایک نئے باب ایک نئے خواب کی تعبیر پر غور کر رہی تھی۔

میر وحید حسن کی ساری کوششیں بے سود ثابت ہوتیں، حویلی کی تعمیر نو کا مسئلہ دیوانے کا خواب نظر آرہا تھا۔ عہد بدل جاتے ہیں۔ تاریخ بدل جاتی ہے۔

اور اب دل کے سیلاب میں چلتے ہوئے شہیر کا سہارا لئے آہستہ آہستہ گھر کو واپس آرہے تھے۔ گھر کا حال تو دل کے حال سے بھی زیادہ برا تھا۔ چلو سب کام سے چھٹی ہوئی۔ لڑکی جوان ہوئی۔ دوسرے گھر گئی اور اب اور اب جانے کہاں سے کفن اور کافور کے بھبکے آرہے تھے۔

سنتے ہیں میر وحید حسن نے اس واقعہ کے بعد سے کچہری آنا چھوڑ دیا اور ایک یہی دروازہ کیا، انہوں نے اپنے اوپر بہت سے دروازے بند کر لئے۔

نصیر صاحب حالات سے مفاہمت کرنا جانتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ مفاہمت اور مصالحت کو راہ نہ دیتے تو غموں کے بھاری بوجھ تلے دب کر جانے کب ختم ہو چکے ہوتے۔

''ہاں صاحب جس شخص کی لاکھ روپے کی تحصیل ہو وہ اس طرح مسجد کی تاریک کوٹھری میں زندہ رہ سکتا ہے۔ آفریں ہے نواب نصیر پر۔''

ظہرو دونوں وقت آجاتا تھا۔ نصیر صاحب کو پکی پکائی مل جاتی۔ لے دے کے بزرگوں کی یادگار ایک گھر گویا رہ گیا جس کے کرایہ دار کچھ اتنے افلاطون تھے کہ ان کے خیال میں وہ کرایہ نہیں

دیتے تھے۔ نواب نصیر کی سات پشتوں پر احسان کرتے تھے۔ نصیر صاحب کا خیال تھا کہ قسمت پر جب تاریک سائے منڈلا رہے ہوں تو ہر انہونی بات ہونی ہو جاتی ہے ورنہ کیا مجال تھی کہ یہ کرایہ دار اتنے خود سر ہو جاتے۔ سرِ شام ہی میاں علی حسن کے یہاں تاش کی نشست جمتی۔ اس محفل میں گھنٹے دو گھنٹے کے لئے تاش کے پتے بھی نکلتے عشاء سے کچھ پہلے یہ محفل برخاست ہو جاتی۔ نصیر صاحب تاش ہمیشہ اپنی ہی جیب سے منگواتے تھے۔ بہت سے معمولات وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوگئے لیکن اس معمول میں انہوں نے کبھی فرق نہ آنے دیا۔ علی حسن دیوانی کچہری میں کار پرداز تھے اور کبھی نواب نصیر کے مصاحب خاص سمجھے جاتے تھے۔ دونوں نے پچھلے دنوں کو فراموش کر دینے ہی میں عافیت محسوس کی تھی۔ زینے سے اترنے والے اور زینے پر چڑھنے والے میں کہیں نہ کہیں تو مڈبھیڑ ہو ہی جاتی ہے۔

جب سے میاں ظہیر نے شوریدہ سری اختیار کی تھی نصیر صاحب کچھ جھکنے سے لگے تھے۔ کیا پتہ کل کلاں کوئی الٹا سیدھا جواب دے دے۔ جس کی ہمتیں اتنی بڑھ چکی ہوں وہ باپ کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ یہی کیا کم ہے کہ دونوں وقت کھانا لے آتا ہے۔ شام کے وقت تاش پہنچا جاتا ہے۔ سچ پوچھیے تو جس شام اس نے اپنے جانے کا اعلان کیا تھا میں نے گویا اپنے دل کو ایک بڑے خطرے کے لئے تیار کر لیا تھا۔ لیکن خدا نے میری سن لی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ علی حسن بھائی کہ یہ کمبخت جوانی ہوتی بھی ہے منہ زور اور اس کا کوئی کنارہ بھی نہیں ملتا۔ کوئی کہہ سکتا تھا کہ یہ مریل سا لونڈا۔ ہونہ ہو آج دھنو نے اس میں پانی ڈالا ہے"۔

اور بالآخر سب اپنی اپنی جگہ پر شانت ہو گئے۔ نصیر صاحب نے سوچا ظہیرو نے جو کچھ کیا چلو اچھا ہی کیا۔ شاید تاریخ اپنے کو دہرا رہی ہو۔ جانے کیوں انہوں نے بار بار کچھ ایسا ہی محسوس کیا تھا۔ لیکن اس تاریخ نے خود ان کی زندگی میں کتنی تلخیاں بھر دی تھیں۔ ان تلخیوں کی جب بھی یاد آتی تو انہیں ایک خیال سا ہوتا کہ کاش ظہیرو نے وہ نہ کیا ہوتا جسے کرنے کے بعد رنج وغم کا شدید احساس تادم واپسیں کچوکے دیتا رہتا ہے۔

وحید حسن صاحب بھی بڑی کوشش سے بچے تھے اور اس اجڑی ہوئی حویلی میں ترک علائق کے مسئلے پر غور و خوض کر رہے تھے۔

ہاں دو جوان دل تھے جو مسرت و شادمانی کی دنیا میں رہتے ہوئے یہ سوچتے تھے کہ آخر

اس طوفان کو کہیں سکون تو نصیب ہو۔ سرکش موجیں ساحل کی تلاش میں تھیں۔

لیکن سرکش موجوں کو ساحل بھی کہاں ملتا ہے۔

ثریا اور ظہرو رات گئے تک نئی زندگی کے خاکے مرتب کرتے رہتے۔ قاضی کے دو بول ایک چھوٹا سا گھر اور اس کی انگنائی کی مسرتیں۔

ڈیوڑھی میں کئی دنوں سے شہنائی بج رہی تھی۔ حویلی میں نئی قلعی کرائی گئی تھی کواڑوں پر بھی نیا روغن چڑھایا گیا تھا۔ گھر میں کتنی عورتیں بھری تھیں، وہ عورتیں بھی تھیں جو اماں کے زمانے میں آتی تھیں۔ کتنے ایسے لوگ تھے جو شادی بیاہ کی تقریبوں میں نظر آجاتے ہیں۔ بڑی پھوپھی، چھوٹی پھوپھی، خالہ امی، ساجدہ خالہ، نسیمہ بھابھی، بھابھی جان، شہلا، ثمینہ، آمنہ، مردانے میں خالد خالو، بڑے پھوپھا جان، چھوٹے پھوپھا جان، جمیل بھائی، احمد بھائی۔

آج مژدے کی رسم ہے۔

آج کندوری ہے۔

''خیر سے اللہ نے یہ دن دکھائے کہ ثریا اپنے گھر کی ہو رہی ہے۔ وحید میاں لڑکا کیا کرتا ہے''۔

''برات آگئی۔ برات آگئی''۔ شہلا نے چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ ''میری لاڈو بہت بنتی ہیں جیسے کچھ سن ہی نہیں رہی ہوں''۔

''تمہارا نکاح   سے بعوض . . سکہ رائج الوقت   تمہیں منظور ہے''۔

اور پھر مردانے میں مبارک سلامت کے درمیان نقل لٹائے گئے۔

شہنائیاں۔ شہنائیاں۔

جیسے کسی نے ثریا کو زوردار تھپڑ رسید کیا تو نے اس تقریب کو ماتمی تقریب بنا دیا اور تجھے ملا کیا . ظہرو۔

لیکن یہ آیا تو کہاں سے آیا۔ کبھی کبھی طوفانوں میں گھر کر بھی سفر کا جائزہ لیا جاتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس موڑ پر پہونچ کر ثریا نے بھی گرد و پیش کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔

ظہرو۔ لیکن چاروں اور تاریکیاں تھیں صرف اوپر ایک خدا تھا اور نیچے، فی الحال تو اسے ناخدا ہی کہنا تھا۔

وسیع حسن صاحب کی انیکسی میں آئے انہیں دس پندرہ دن ہو چکے تھے، وکیل صاحب خاصے خوش اخلاق تھے اور ظہرو نے محسوس کیا تھا کہ اپنی انتہائی مصروفیتوں کے باوجود وہ دن میں دو ایک پھیرے انیکسی کے ضرور لگا لیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اندیشوں میں گھر جاتا اور انجانا سا خوف اس کے اعصاب میں جھرجھری سی پیدا کر دیتا لیکن وہ جلد ہی اس ذہنی انتشار سے دامن کھینچ لیتا۔

خود ہی دونوں نے نکاح کی تاریخ طے کر لی۔ ایک طرف میر وحید حسن تھے جو بیٹی کی میت دفن کر صبر کر بیٹھے تھے۔ دوسری طرف نصیر صاحب تھے جو آج بھی ظہرو کے لئے فرشتۂ اجل حیثیت رکھتے تھے۔ ہر چند کہ نصیر صاحب کا خود یہ خیال تھا کہ ہوا ان کی مخالفت میں چلنے لگی ہے اور ظہرو نے کھلی فضا میں ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیا ہے۔

"اور سو بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ ہم نے کسی معاملے میں اپنے بوڑھوں سے مشورہ تو کیا نہیں تھا پھر آج ان سے پوچھنا کہاں تک مناسب ہوگا"۔

شاہ میرن کو نکاح کی تاریخ بتا کر اور ان سے نکاح پڑھانے کا وعدہ لے کر ظہرو بازار کی طرف نکل گیا۔

ثریا نے جو اسے سوا سو روپے دیئے تھے انہیں روپیوں سے اسے سب کچھ کرنا تھا۔ وہ ظہرو بھی تھا، نصیر صاحب بھی تھا اور میر وحید حسن بھی تھا۔

اور جب شام کے دھندلکے انیکسی پر چھا گئے تو ظہرو اپنی گٹھری سنبھالتا پہونچا۔ گٹھری جس میں نصیر صاحب کا حوصلہ تھا۔ میر وحید حسن کے ارمان تھے اور ظہرو کے خوش آئند خواب تھے۔ لیکن جانے کیوں انیکسی پر کچھ اجنبی سی فضا طاری تھی وہ بجلی کے قمقمے جو سرشام روشن ہو جایا کرتے تھے اب تک مجھے بجھے سے تھے لڑکے جو کھیلتے کھیلتے انیکسی تک آ جایا کرتے تھے۔ جانے آج کہاں غائب تھے۔

اور میرا کمرہ میری ثریا دستک دستک دستک کواڑ کے ایک چھوٹے سے سوراخ نے اسے بہت سی روشنی کے درمیان پہونچا دیا۔ لیکن یہ روشنی۔ یا خدا کتنا اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا ہے۔ جیسے کسی نے ظہرو کو گندھک کے تیزاب میں ڈال دیا ہو۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے شیشے کا برتن پکے فرش پر گرتے ہی چکنا چور ہو چکا

تھا۔

اس وسیع وعریض دنیا میں آج وہ کتنا اکیلا تھا۔تو کیا ثریا یہی تھی،طوفانی لہروں میں بہنے والی تیز آندھی میں،کتاب کے صفحے کھلتے رہے۔ بند ہوتے رہے۔تو کیا ثریا یہی تھی اور جب گدھ نے ہڈیاں نچوڑ لیں تو وہ چپکے سے چٹخنی کھول کر اندھیری راہداری میں گم ہوگیا۔ظہرو کے دل پر کسی نے جیسے دکھ درد کی سل رکھ دی۔

کیا پتہ اس نے جو پھل چکھا ہو اس پر پہلے بھی کسی کے دانت لگ چکے ہوں۔ بسا بسایا شہر آن کی آن میں آتش فشاں کی نذر ہو گیا لیکن میری امانت

آخر وہ ثریا کدھر گئی جس نے اسے نئی راہیں دکھائی تھیں، جس نے اسے جینے کا حوصلہ دیا تھا۔ بہت سی گالیاں بہت سے گندے فقرے بار بار اس کی زبان کی آخری سرحدوں پر آ کر دم توڑ جاتے تھے۔ کچھ تو بخار نکل جاتا۔

''تم ایک ہی طوفان سے نڈھال ہو گئے زندگی میں جانے کتنے طوفان آئیں گے اور گزر جائیں گے۔ کتنی ہی موجیں اٹھیں گی اور بالآخر سرد پڑ جائیں گی''۔

سیٹیاں سی گونج رہی تھیں۔

''سید صاحب یہ خدائی خوار۔اپنی بے وفا ماں کی اکلوتی نشانی''۔

لیکن اب ہم ساتھ نہیں رہ سکتے۔اب ہم قطعی ساتھ نہیں رہ سکتے۔ یہ آواز ایکسی کے وسیع وعریض احاطے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

ایک ثانیے کے لئے ظہرو کا جی چاہا کہ وہ اس کالے کا سر کچل دے جو اس کی ثریا کو ڈس کر آہستہ سے راہ داریوں میں گم ہو گیا تھا۔وہ عزت دار ابھی بھی برساتی کے نیچے پھن اٹھائے بیٹھا تھا۔

سمجھو ہم دونوں ایک حادثے میں مل گئے تھے پھر حادثے میں الگ ہو گئے۔

ثریا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور برساتی کے نیچے کوئی عزت دار اپنے کاموں میں مگن تھا۔

ظہرو نے ایک گٹھری ایک صندوقچی رکشے پر رکھ دی۔

یہ ٹسوے کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو۔اپنے باوا کے گھر جاؤ اور اگلے سال جب یہ

پب باہر آ جائے تو پھر کسی اور کے ساتھ ٹیکسی میں چلی آنا۔ لیکن ٹیکسی ہی کیوں۔ اس سے آگے بھی کچھ اور مقام ہیں۔ نشیب پر رک کر دم لینا بھی مشکل ہوتا ہے۔ چیزیں کتنی تیزی سے لڑھکتی ہیں"۔

رکشے والے نے سگریٹ کا کش کھینچتے ہوئے مڑ کر دیکھا اور معنی خیز انداز میں پوچھا

"کدھر جانا ہے آپ کو"؟

"میرا گھر دیکھا ہے؟"

لیکن گھر تو عزت دار بیبیوں کے ہوتے ہیں۔ کسی نے پورے وجود کو نشیب پر لڑھکا دیا۔ نشیب۔ نشیب

تو پھر؟۔ اور پھر کسی نے ایک بیزاری سے لہجے میں جواب دیا۔ میں کیا برا ہوں۔

برا کوئی نہیں ہے۔ ہم سب آندھیوں کی زد میں ہیں وہ جدھر چاہیں ہمیں بہا لے جائیں۔ ہمارے بس میں کیا ہے۔ یہ آندھیاں کتنی تیز ہیں یا خدا یہاں تو کان پڑی آواز بھی نہیں سنائی دیتی۔

ایک تنگ و تاریک گلی میں رکشا مڑ گیا۔ ثریا نے ناک پر رومال رکھ لیا۔ سخت سڑاند آ رہی تھی۔ کچے فرش، کھلی نالیاں، گندگی کے ڈھیر۔ ہر جگہ عفونت ہی ہے۔

رفیق نے اپنے کمرے کے آگے رکشا روک کر کہا۔

"بی بی چلو تو یہیں اتر جاؤ"۔

ہم سب آندھیوں کی زد میں ہیں۔ ہم سب آندھیوں کی زد میں ہیں۔

"ہاں اب تو اترنا ہی ہے"۔

کمرے میں تاریکی تھی۔ رفیق رکشے کا لیمپ نکال کر کمرے میں داخل ہوا۔ ثریا بھی پیچھے ہو لی۔ رفیق نے جلدی جلدی کونے میں رکھی لالٹین کو صاف کیا۔ کھاٹ پر گدا پڑا تھا۔ اسے اپنے تہبند سے جھاڑتے ہوئے بولا "بی بی بیٹھ جاؤ۔ میں ذرا نل پر منہ دھو کر آ رہا ہوں"۔

ثریا کی نگاہیں تھکے تھکے قدموں سے کمرے کی ان چیزوں کی طرف بڑھ رہی تھیں جن میں بظاہر آپس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ مٹی کی ہانڈی میں سگریٹ کے خالی ڈبے۔ تام چینی کی ٹوٹی پھوٹی صابن دانی میں کنگھی کا ایک ٹکڑا اور کمرے کے ایک کونے میں رکشے کا ایک پھٹا ٹیوب۔

اوراب یہی منزل ٹھہری تھی۔ رات کی رات یہاں دم لے لیں، پھر صبح ہوتے ایک نیا سفر شروع ہو جائے گا۔ سفر۔ منزل۔ ساتھی۔ یہ وہ اصطلاحیں تھیں جو ثریا کے لئے، دردِ سر بن گئی تھیں۔ نہ کوئی متعین سفر تھا نہ کوئی منزل تھی اور نہ کوئی ساتھی۔

ظہرو نے ایک بندسی کتاب کو اوراقِ پریشاں میں بدل دیا تھا۔ ایک داستان ختم بھی نہیں ہو پاتی تھی کہ دوسری شروع ہو جاتی تھی۔

رفیق کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چپاتیوں کی ایک پلیٹ اور ایک کٹورا سالن تھا۔

لیکن داستان کا تیسرا باب کتنا عجیب سا تھا۔ ثریا کو کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے اچانک اس کے قدم پھسلتے ہوئے کئی ایک زینے نیچے چلے آئے۔ ایک دھچکا سا معلوم ہوا۔ لیکن اس طلسماتی سفر میں پیچھے مڑ کر دیکھا اور پتھر بنے۔

ہم سب طوفان کی زد پر ہیں۔ ہم سب طوفان کی زد پر ہیں۔ دیکھو یہ ریلا کہاں بہا لے جاتا ہے۔

کھانے کے بعد رفیق جانے کہاں سے ایک کھاٹ لے آیا۔ "بی بی میں باہر سوتا ہوں تم اندر سے بند کر لینا"۔

کمرے میں سخت گرمی اور گھٹن تھی۔ چھوٹی سی کھڑکی سے بس کبھی کبھی پُروا ہوا کے جھونکے اندر آ جاتے لیکن ان سے تو پسینہ بھی نہیں خشک ہوتا تھا۔

پر کھاٹ کے بھی تو قدم تھے۔ آہستہ آہستہ۔ اور آخر ایک دن انہوں نے منزل پر پہنچ کر دم لیا۔ منزل جہاں پہنچ کر بھی شاہ و گدا گم کردہ منزل ہو جاتے ہیں شاہ و گدا۔

اور جب دوسرے دن رفیق نے کھٹملوں سے پریشان ہو کر کھاٹ باہر نکال دیا تو مزدور شاعر، احمد علی خنجر کے جو شفاعت حسین کے بیڑی گودام میں بیڑیاں بنایا کرتا تھا اور بیڑی مزدوروں کی تحریک میں پیش پیش رہا کرتا تھا چاند ہوٹل کے مالک فدا حسین سے کہا تھا۔ "زاغ کی چونچ میں انگور خدا کی قدرت"۔ اس طرح جیسے کھٹے انگوروں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

زندگی ہر صبح ایک نئی قبا بدل لیتی ہے۔ کل کچھ تھی، آج کچھ ہے اور آنے والے دنوں میں جانے کیا رنگ بدل لے۔ رفیق کے رکشے کے لیمپ کا شیشہ صاف ستھرا اور چمکدار رہا

کرتا۔ اس کی بتی برابر سے کاٹ کر درست کر دی جاتی اور پھر اس میں تیل ڈال کر اسے روشن کر دیا جاتا۔ یوں روشنی تو ثریا کے دم سے تھی۔ روشنی کے اس جھماکے نے اس کی تعفن آلود کوٹھری میں پناہ لی تھی۔ کاش یہ روشنی ٹھہر جاتی۔ یہ سیل نور یہیں بس جاتا۔ پر میرے کھردرے کھردرے سے ہاتھ، میری ناشائستہ زندگی۔ آخر اسے کیوں کر روک سکتی ہے۔ رفیق کو ایسا محسوس ہوتا جیسے پانی کی سطح پر اس نے چاند کو پکڑ لیا ہو بس ایک ہلکی سی آوارہ سی موج اس سے چاند کو چھین لے جا سکتی ہے۔ رفیق شیش محل میں تو داخل ہو چکا تھا مگر سہما سہما سا ڈرا ڈرا سا''۔

''بی بی محلے کے لونڈے بڑے شریر ہیں ادھر تم نے دروازے سے باہر قدم نکالا اور ادھر ڈھیلے پڑے''۔

لیکن ایک نہ ایک دن تو نکلنا ہی ہوگا اور وہ دن قریب آرہے تھے تیزی سے۔ غبارے میں آہستہ آہستہ ہوا دی جا رہی تھی۔ یا اللہ کیا ہوگا۔ رفیق کہتا ہے ذرا سر نکالا اور ڈھیلے پڑے۔ لدی پھندی جھڑبیری کی شاخ۔ یہاں بھی تو وائی آسکتی ہے لیکن نہیں آنکھ کھولنے والا آخر کیا کرے گا۔ عفونت۔ گندگی۔ امس۔ نہیں وہ ڈھیلوں کی بارش میں بھی چلی جائے گی۔

ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ سمندر کی لہروں پر ہلکورے کھا رہی ہو، ایک سرگرانی، بے چینی، اضمحلال۔ شاید یہ سب ہی باہر آجاتا۔ رفیق کو اپنے بے چینی کے وہ دن یاد آرہے تھے۔ جب اس کی بہن بھی اس قسم کے ایک سمندری سفر سے دو چار تھی کٹ گئیاں۔ کمرخ اور جانے کیا الم غلم۔

ادھر کئی دنوں سے اسے ظہرو یاد آرہا تھا۔ کوئی تو اسے بلا دیتا۔ وہ جو اس کے لئے سب کچھ تھا۔ اس کا ساجھے دار۔ ظہرو جس کے لئے جھڑبیری کی شاخ آپ ہی زمین تک جھک گئی تھی۔

لیکن ظہرو تو پھر نصیر صاحب کی تحویل میں جا چکا تھا۔ ثریا کو رفیق کے رکشے پر رخصت کر کے وہ دبے قدموں نصیر صاحب کے یہاں پہنچا تو نصیر صاحب نے نظروں ہی نظروں میں پوری داستان پڑھ لی۔ وہ منہ زور گھوڑا جس پر سوار ہو کر ظہرو نے نصیر صاحب کو دہلا دیا تھا اپنے سوار کو گرا کر جانے کس سمت بھاگ گیا تھا اور اب وہی ظہرو تھا وہی نصیر صاحب تھے۔

''ظہرو ذرا حقہ بھر دے۔ ہوتا ہے، ہوتا ہے یہ سب ہوتا ہے''۔ نصیر صاحب نے ظہرو

کی آنکھوں کے ٹمٹماتے چراغ کو دیکھ لیا۔ لیکن تو اگر اصل کا ہوگا تو پھر کبھی اس قطامہ کے پاس نہیں پھٹکے گا۔"

رفیق نے ہانک لگائی، ظہیر بھائی۔ ثریا کی چٹھی تھی۔ رفیق یقینی ظہرو سے تگڑا پڑتا تھا ورنہ ظہرو اس کی مشکیں کس کر پچاس جوتے مارتے۔ حرامزادہ شریفوں کی بہو بیٹیوں کو اڑا لے جاتا ہے۔ لیکن سچ پوچھو تو مشکیں تو اس اندھیرے کے شہنشاہ کی کسی جائیں اور ظہرو نے چیختے ہوئے کہا "مجھ سے اس کا کوئی تعلق نہیں" رفیق کی چٹھی کے پرنچے اڑ چکے تھے۔ "جو قبضہ جمائے بیٹھا ہے وہی سب کچھ کرے، بازاری مال پر تو قبضہ چلتا ہے"۔

نصیر میاں نے آواز دی۔ "ظہرو یہ کون ہے"۔

"آپ کی بہو کا یار"۔ آواز دب کر رہ گئی۔ رفیق آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرتا ہوا اتر گیا۔

سنتے ہیں ثریا نے رفیق کو میر وحید حسن کے یہاں بھی بھیجا تھا اور میر صاحب نے اجڑے ہوئے انداز میں جواب دیا تھا کہ میری بیٹی ثریا تو کب کی ختم ہوگئی جانے تم کس کا ذکر کر رہے ہو۔ بڑی اچھی تھی میری بچی تم نے اس کی تصویر دیکھی ہے، ٹھہرو دکھاتا ہوں۔ اور رفیق رسیاں تڑا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

تو بس اب یہی ایک رفیق تھا، چلو یونہی سہی۔ ہم سب تو طوفانوں کی زد پر ہیں اور جب طوفان آتے ہیں تو کون کس کا ساتھ دیتا ہے۔

جانے کون سی بلا تھی، ثریا کو کسی پہلو قرار ہی نہیں ملتا تھا۔ چلو بی بی اسپتال چلیں۔ چنانچہ اسپتال کے خیراتی وارڈ میں اسی رات بے شمار تختیوں کے درمیان جو کرب و آلام کے عالم میں جھول رہی تھیں ایک اور تختی کا اضافہ ہوگیا۔ ثریا زوجہ ظہیر علی۔

ثریا نے سوچا خوابوں کا انت اسی طرح ہوتا ہے۔

اور جب ظہیر نے سنا کہ ثریا سیزیرین آپریشن کے درمیان ختم ہوگئی تو اس نے ڈھیرے سے اپنے مجرم ضمیر کو آواز دی۔ لیکن حالات بھی تو بے قابو ہو چکے تھے۔ یہ ضمیر کا جواب تھا۔ ہاں وہ زندہ ہے فاختہ نے طوفان کے گزر جانے کی خبر دی تھی۔

کہاں ہے وہ؟

رفیق کا ٹھٹھا اٹھ کر رہ گیا۔ ''مرنے والی مرگئی لیکن اس سالے نے ایک دن بھی جھانکی نہیں ماری اور آج چلا ہے بچے پر حق جتانے''۔ سچ تو یہ ہے کہ رفیق کا رکشہ تک اس تیمارداری میں اونے پونے بک چکا تھا اور اب وہ بزار کا رکشہ ہانک رہا تھا۔

''سن لو ظہیر میاں مرنے والی مرتے دم کہہ گئی تھی کہ بچہ میں ہی رکھوں۔ مرنے والوں کی آخری خواہش تو سب ہی اٹھاتے ہیں''۔

لیکن نصیر میاں تو جیسے سن کر بھبک اٹھے۔ ''یہ کیا بیہودگی ہے۔ ہمارا بچہ اور ایرے غیرے کے پاس پلے۔ ظہرو آخر تیری غیرت کو کیا ہوا ہے''۔ نصیر صاحب نے ایک ٹیڑھی اینٹ ڈال دی تھی تو یہ ضروری تھا کہ سبھی ان کی تقلید میں ٹیڑھی اینٹ ڈالتے، لیکن فطرت کے اپنے اصول تھے۔ ٹیڑھی دیوار کب کسی کے سنبھالے سنبھلتی ہے۔

رفیق تو مرنے والی کی وصیت سے پھرنے کو کسی حال میں تیار نہیں تھا ''ہاں بھیا ہونڈا سیونا ہو کر تمہارے یہاں چلا جائے تو اس کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہے''۔

ظہرو کو محسوس ہوا کہ نصیر صاحب کی وجہ سے زندگی کے ہر موڑ پر کچھ مسائل کا اضافہ ہی ہوا ہے۔ ہم سب ورثہ میں جو اہم شے حاصل کرتے ہیں وہ زندگی کے تلخ حقائق ہی ہوتے ہیں۔

حمید اللہ کی بیٹھک میں محلے کے کئی اور سربرآوردہ لوگ بھی موجود تھے۔ ''تم آخر اس پر کس طرح حق جتانے آگئے۔ تم سے سخت پرسش ہوگی۔ ایک عزت دار گھرانے کی لڑکی کو خراب کیا اور پھر اسے جہنم میں ڈال کر بھاگ گئے''۔

''اسپتال تک نہیں گیا۔ مرنے والی اس کا انتظار دیکھتے دیکھتے مرگئی''۔

''خاں صاحب سوچنے کی بات ہے اگر رفیق نہ ہوتا تو اس غریب کا کیا حشر ہوتا اسپتال میں تو لاوارث میت کو ڈاکٹروں کے شغل کے لئے دے دیا جاتا ہے''۔

''سنو میاں ظہیر، ہماری شرافت ہے کہ ہم نے تمہیں معاف کر دیا ورنہ کام تو تم نے جوتے کھانے کا کیا ہے۔ بہر حال اب بچہ تمہیں کسی قیمت پر نہ دیں گے''۔

''اور مٹے میاں اس سے کہہ دو۔ کہیں اور سر پھوڑے بچوں کی کیا کمی ہے''۔

قہقہوں کے درمیان ظہرو اپنے کردہ گناہوں کو آنسوؤں کی دبیز تہہ میں دبانے کی

کوشش کر رہا تھا۔

تو ظہیر تو اپنا حق بھی نہ جتا سکا۔ نصیر صاحب ٹھنڈی سانس بھر کر خلاؤں میں مستقبل کو تلاش کر رہے تھے۔

سب کچھ سہی پر ظہیر مانگے کا چراغ تو نہیں ہے۔

ظہرو ادھر کچھ دنوں سے انجمن فلاح المسلمین کے مدرسہ میں نائب مدرس ہو گیا تھا۔ بیس روپے ماہوار کی یہ آسامی ظہرو کے لئے بری نہیں تھی۔ اس کے علاوہ وہ دو ایک بچوں کو گھر پر بھی پڑھا آیا کرتا تھا۔ ظہرو نصیر صاحب کے لئے عصائے پیری بنتا جا رہا تھا۔ شکر ہے یہ راہ پر لگ گیا اور جب کوئی شئے راہ پر لگا دی جاتی ہے تو پھر وہ اپنی افتاد سے چلتی رہتی ہے۔

پر ظہرو کے چہرے پر اب ویران اور مسمار عمارت کا گمان ہوتا تھا۔ غنیم کی فوجیں شہر کو خاک و خون میں ملا کر گرد اڑاتی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ نصیر صاحب سوچتے شاید ثریا نے جو دیئے جلائے تھے وہ ہنوز جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔ سسرے سے کوئی پوچھے پھر اسے گالیاں دے کر نکال کیوں دیا تھا۔ سر منزلیں طے کرنے کے بعد ہر شخص بخوبی سفر کا جائزہ لے سکتا ہے۔ جوانی دراصل ایک حد درجہ جذباتی اور ہنگامی فوج ہوتی ہے۔ میری عمر کو پہنچ کو ظہرو کبھی ایسی حرکت نہ کرتا۔

لیکن ظہرو آخر کب تک صحرا نوردی کرتا رہے گا۔ دم لینے کو کہیں کوئی ٹھنڈی چھاؤں تو ملے اور بالآخر ظہرو کو ہم نوا مل ہی گیا۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں ایک بار پھر تلاطم پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اس بار وہ باجے گاجے کے ساتھ نکاح کے دو بول کے بعد آئی تھی۔

سرخ سی گٹھری بنی۔ مگر وہ شوخ و شنگ سا تجربہ جانے کہاں چلا گیا تھا اب ہر موڑ پر ایک ٹھہراؤ تھا۔ کیا فرق آ گیا تھا۔ ثریا اور زبیدہ دونوں گھریلو لڑکیاں تھیں۔ فرد کے تصورات سماج کے تصورات سے کیوں ہم آہنگ نہیں ہو پاتے۔

تفضل حسین کی بیوی مر چکی تھی اور یہی ایک بچی ان کی بیوی کی اکلوتی یادگار تھی جس نے ان کی مقبرے جیسی خاموش زندگی میں چراغ جلا رکھا تھا۔ نگینہ سازی ایک عرصے سے خاندان میں چلی آ رہی تھی۔ رہنے کو ایک بڑا سا آبائی مکان تھا جہاں وہ دال روٹی میں مست تھے۔ زبیدہ کی شادی میں میاں تفضل حسین نے یہ شرط لگا رکھی تھی کہ لڑکی ان کے گھر سے کہیں

اور نہیں جائے گی۔ گویا نصیر صاحب کی دیرینہ خواہش مبارک سلامت کے ہنگاموں میں منزل پر پہنچ گئی۔ پھر ایک دن نصیر منزل کے صدر کمرے میں بیٹھے بیٹھے یکایک ان کے دل پر بجلی سی گر گئی۔ یہ شخص مجھ سے نظر ملانے کی جرأت کرتا ہے۔ ایک نگینہ ساز کی حیثیت ہی کیا ہے لیکن ظہرو بھی تو آخر کسی کی اولاد ہے۔ وہ بڑی سرعت سے ہانپتے کانپتے نیچے اتر گئے۔ اب انہیں کھلے میدانوں ہی میں عافیت ملتی تھی۔

''نواب صاحب ایک چھوٹی سی درخواست ہے آپ یہیں آجائیں تاکہ ہم بھی اپنی قسمت پر ناز کریں۔ یہ سب وقت کی بات ہوتی ہے اور وقت جیسے ظالم سے مصالحانہ رویہ ہی اختیار کرنا چاہئے''۔

ظہرو نے بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے سسر کی اس پیشکش پر صاد بنادی۔

''زندہ رہنے کے لئے بھی ایک چھت کی ضرورت ہوتی ہے اور مرنے کے لئے بھی ایک چھت کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کی یہی خواہش ہے تو آجاؤں گا۔''

نواب نصیر جنہوں نے شاہی اور فقیری دونوں کے مزے چکھے تھے، جو ایک جاتی ہوئی دنیا اور ایک آتی ہوئی دنیا کے پاٹوں کے درمیان پس سے گئے تھے، جنہیں وضعداری اور نجابت ورثہ میں ملی تھی ایک شب داستان پارینہ بن گئے۔

پھر ایک مضبوط ہاتھ نے ایک دوسری کتاب بھی بند کردی جس کے سرورق پر تفضل حسین تحریر تھا۔

وقت کی باگ ہمارے قبضہ قدرت سے باہر ہوتی ہے۔ ظہرو کو ایسا محسوس ہوتا جیسے ایک لمبے عرصے تک بادیہ پیمائی کرتے کرتے تھک سا گیا ہے اور اسے جیسے ٹھنڈے پانی کے چشمے کی تلاش ہے۔ اس کے ازدواجی سفر نے کئی منزلیں طے کر لی تھیں۔ لیکن وہی روز ازل کی تنہائی اور سناٹا تھا۔ وہی گھر تھا جس میں ظہرو بولتا تھا تو زبیدہ سنتی تھی اور زبیدہ بولتی تو ظہرو سنتا تھا۔ تیسرا کوئی بولنے والا نہیں تھا کوئی سننے والا نہیں تھا۔

ان دنوں وہ مدرسے میں معلم تھا اور فرصت کے اوقات میں دونوں میاں بیوی تھوک فروش بساطیوں کے آرڈر پر کارڈبورڈ کے ڈبے بنایا کرتے تھے۔ اس طرح گھر میں اکٹھے چالیس پچاس روپے ماہ بہ ماہ آجاتے اور اس پر ظہرو کا انتظام۔

نیک بخت کے سر میں ڈالنے کے لئے آدھ پاؤ کھوپرے کا تیل مہینے کی پہلی کو آتا اور دوسرے مہینے کی پہلی کو وہ ختم ہوتا۔

اگر ہم نے کفایت سے کام نہ لیا تو ہمارا حشر بھی اس بھوترے جیسا ہوگا ۔۔ تجربے، روایتیں اور اصلاحی قصوں کی مدد سے ظہرو اپنی راہ ہموار کرنے کی کوشش کرتا۔

زبیدہ کو یقین ہوگیا تھا کہ اس بے آب وگیاہ زندگی کی ساری ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے ورنہ ظہرو تو......

اور جب سناٹے کا احساس شدید ہونے لگتا تو وہ ظہرو سے کہتی۔

''میں نے ایک لڑکی دیکھی ہے آپ کہیں تو''۔

لیکن ظہرو نے کبھی اس سمت میں اس کی ہمت افزائی نہیں کی۔

''تمہاری اس روز روز کی بکواس سے ہم تنگ آگئے ہیں۔اسی پر اللہ کا شکر کرو چالیس پچاس روپلیوں میں کیا پھل نکلیں گے''۔

اور زبیدہ کو ایک مجرم سے ضمیر کی موجودگی میں عجیب بوجھل پن کا احساس ستانے لگتا، پر یہ صحرا نہیں تھا گھر تھا جہاں ہر کس و ناکس کو چراغ کی ضرورت ہوتی ہے۔اندھیرا کسے پسند ہے۔

''آخر اسے کیوں نہیں لاتے''۔

''کیسے۔؟''

ظہرو سوچ میں پڑ گیا۔نواب نصیر نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔''ظہرو آخر تیری غیرت کو کیا ہوا ہے''۔

''یہ آپ کیا ذکر لے بیٹھے نواب صاحب''۔

''لیکن وہ تو رفیق کے پاس ہے۔اس حرامزادے نے تو پہلے ہی دن دینے سے انکار کردیا تھا''۔

''ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں''۔

ظہرو بھیا میں نے تم سے پہلے ہی دن کہا تھا کہ ثریا مرتے مرتے کہہ گئی تھی کہ اسے کسی اور کو نہ دینا۔مرنے والوں کی بات تو سب ہی رکھتے ہیں۔ہاں پہلے بھی ہم نے یہ کہا تھا اور آج

بھی کہتے ہیں کہ لونڈا سیانا ہو کر جہاں سنگ سمائے چلا جائے۔

''بابو انہیں سلام کرو''۔ اور چار سال کا بابو 'تلام تلام' کہہ کر رفیق کے کاندھے پر سوار ہو گیا۔

''کیا نام رکھا ہے اس کا رفیق بھائی''۔

''ابھی تو بھیا 'بابو' ہی کہلاتا ہے''۔

''لئیق نہیں''۔

اور رفیق نے شکایت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے محض 'نہیں' میں جواب دیا۔

''تو آج سے یار اسے منیر کہو''۔

عید کے دن قریب تھے۔ زبیدہ کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا لیکن رفیق کی وہی ایک رٹ تھی جسے محلے کے بیشتر لوگوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ منہ زور موجوں کا مقابلہ سر جھکا کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ آخر وہ نصیر صاحب کا لڑکا تھا۔ ان کی محبت میں پلا تھا۔ اور پھر تھکا ماندہ جانور شام کے قریب اپنے ہی تھان میں تو بندھتا ہے۔

زبیدہ نے منیر کے کپڑے سیئے تھے۔ اس نے منیر کو اب تک نہیں دیکھا تھا۔ لیکن ظہرو نے کئی بار اتنی تفصیل سے منیر کے متعلق بتایا تھا کہ زبیدہ نے کئی بار تصور ہی میں اس چار سال لڑکے سے گفتگو کی تھی۔ اسے نہلا دھلا کر شاہزادہ بنایا تھا اور پھر اسے پریوں کے دیس میں بھیج دیا تھا جہاں سے وہ ایک پری زاد کو ہوا کے گھوڑے پر بٹھا لایا تھا۔ ایک ہلکی سی کرن سارے میں اجالا پھیلا دیتی۔

رفیق نے منیر کو کپڑے پہنا کر ظہرو کے سامنے کر دیا۔ ''ابا کو سلام کرو بیٹا!'' نادانستہ طور پر اس نے پہلی بار منیر کے سامنے اس رشتے کا انکشاف کیا۔ لیکن سراسیمگی حیرت و استعجاب کے لئے جس پختگی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ابھی منزلوں دور تھی۔

پھر بقر عید آئی۔ اس بار بھی زبیدہ نے منیر کے لئے کپڑے تیار کئے تھے۔ ظہرو ان باتوں کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتا تھا۔

''نیک بخت تو نے کبھی اپنی چادر دیکھی ہے''۔

لیکن خشک زمین پانی کے لئے کس طرح فریاد کرتی ہے اس کا علم ظہرو کو نہیں تھا۔

ظہرو بھی کبھی کبھی سوچتا کہ آخر رفیق کی کوٹھری کی طرف اس کے قدم بار بار کیوں بڑھ جاتے ہیں اور کیوں بہت سی خفتہ خواہشیں، انجانی تمنائیں بار بار رفیق کی کوٹھری پر دستک دیا کرتی ہیں۔

''ارادہ ہے بھیا کہ یہ چاند دیکھ کر اسے مولوی رشید کے مدرسے میں بٹھا دیں۔ ابھی چھوٹا ہے لیکن ذرا مولوی کی مار تو کھالے۔'' اور ظہرو نے سوچا کہ وہ مولوی رشید کے والد مولوی وحید کی مار نہ کھاتا تو زندگی کے اس پتھریلے راستے پر چلنا دشوار ہو جاتا۔ گویا مولوی کی مار نے اسے مجاہد بننے کی ہمت دلائی تھی۔

رفیق کا خیال تھا کہ زندگی رکشے کی طرح چلتی ہے۔ کبھی تیز تیز کبھی آہستہ آہستہ خرام اور پھر کبھی جیسے بالکل رک سی جاتی ہے۔ یہ لڑکا پڑھ رہا ہے میں دن بھر میں تین چار روپے کما لیتا ہوں۔ ہم دونوں کے لئے ابھی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن جب وہ اس معصوم کے مستقبل میں ان راہوں کو دیکھ لیتا جو اس کے باپ کے گھر کو جاتی تھیں تو ایک لحہ کے لئے اس کے اعصاب میں تناؤ سا پیدا ہو جاتا اور رکشا چلاتے ہوئے اسے ان ویران راہوں میں خوشنما پھول لگانے کی خواہش پیدا ہوتی، پھول جو اس کے باغ کے کہلائیں اور جیسے رکشا رک سا جاتا۔

مدرسے میں پڑھتے ہوئے اسے تقریباً دو سال ہو چکے تھے۔ رات گئے جب رفیق رکشا لے کر آتا تو منیر فتح علی کی کوٹھری میں پڑا سوتا ملتا۔ فتح علی آبکاری کے سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں چپراسی تھا اور پانچ بجتے بجتے گھر لوٹ آتا تھا۔ بال بچے مضافاتی قصبے میں رہا کرتے تھے جہاں فتح علی ہر ہفتہ کی شام کو جاتا تھا اور پیر کی صبح کو واپس لوٹ آتا تھا۔ چھٹیوں کے دنوں میں بھی فتح علی قصبے ہی میں رہا کرتا تھا۔ فتح علی نہیں رہتا تو رفیق منیر کو محبوب خاں کے حوالے کر جاتا جو شہرو کے گودام میں بیڑیاں بنایا کرتا تھا اور ایک سوکھی سہمی مدقوق سی بیوی اور ایک باؤلی سی الجھے الجھے بالوں والی بچی سمیت ایک آبائی کھپریل کے کچے مکان میں جس کے دو تہائی حصے کرائے پر لگے ہوئے تھے صرف ایک کوٹھری اور ایک پچی محبوب خاں کے قبضے میں تھی، رہا کرتا تھا۔ محبوب خان کا کوئی بچہ نہیں تھا اس لئے دونوں میاں بیوی منیر کو اپنے بچے کی طرح سمجھتے تھے لیکن رفیق کو اس کے یہاں کا آنا جانا زیادہ پسند نہیں تھا کہ ایک تو وہ باؤلی چھوکری کھیل کود میں منیر کو چپکے سے جوؤں کا تحفہ دے دیا کرتی تھی پھر بڑی بات تو یہ تھی کہ محبوب خاں کی بیوی کو

بقول رفیق پرانی بیماری تھی۔

منیر اس درمیان میں چوتھا پارہ شروع کر چکا تھا۔ اردو کے کئی قاعدے اس نے ختم کر لئے تھے اور ''اٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں '' خوب لہک لہک کر سنایا کرتا تھا۔ مولوی صاحب نے برادرم شمس الدین کی تختی بھی اچھی مشق کرادی تھی۔ رفیق سوچتا اب منیر ڈاکخانے اور کچہری کے سامنے چٹھیاں اور عرضیاں لکھنے کا کام تو کر ہی لے گا۔ رفیق نے زندگی کا ایک رکشہ کھڑا کر دیا تھا، اب اس کا چلانا منیر کا کام تھا۔ پر وہ تو جلد ہی ایک نئی راہ کی سمت چل کھڑا ہوگا اور چشم زدن میں وہ رفیق رکشا والا بن جائے گا۔ اس مقصد میں جو بے مقصدیت کا پہلو تھا اسے سوچ کر رفیق کچھ بے مزہ سا ہو جاتا تھا۔

لیکن ظہرو خوش تھا کہ اب کوئی دن میں منیر اپنے بال و پر تولے گا اور اپنے آشیانے کی طرف لوٹ آئے گا۔ وہ گلی اس کے لئے بیگانی ہو جائے گی جہاں مرنے والی اسے چھوڑ گئی تھی۔ وہ کوٹھری انجانی ہو جائے گی جہاں فضول چیزوں کے جھرمٹ میں اس نے چلنا پھرنا اور بولنا سیکھا تھا۔ وہ شخص اس کے لئے غیر ہو جائے گا جس نے اور اچانک ظہرو کو یہ بات سوجھتی کہ سخت الو کا پٹھا ہے رفیق بھی۔

رفیق نے فتح علی کی کوٹھری میں جھانک کر دیکھا تو منیر تاڑ کی چٹائی پر سر کے نیچے ہاتھ دھرے سو رہا تھا اور فتح علی ناک کے آخری سرے پر عینک جمائے روزنامہ انقلاب میں مست تھا۔ منیر کے چہرہ پر ایک معصوم سی آسودگی سایہ کئے تھے۔ مچھروں کے دلدل نے کوٹھری پر ہلہ بول دیا تھا اور فتح علی کی چٹاخ پٹاخ خاموشی کو بار بار اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ پر منیر کے باب میں تو گویا مچھروں کو پوری چھوٹ تھی۔ رفیق نے اسے اٹھایا تو جیب میں کوئی شئے جھنجھنائی۔ یہ شیشے کی گولیاں تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ منیر کو وہیں پٹخ دے۔ یعنی کہ اب سبق گلیوں میں یاد کئے جاتے ہیں اور اسے ایک عجیب سی یاسیت، بیزاری اور دل شکستگی کے احساس نے آگھیرا۔ میں غریب آدمی کس کس طرح اسے پڑھاتا ہوں اور یہ گلیوں میں اپنا وقت ضائع کرتا ہے۔ منیر صبح سو کر اٹھا تو رفیق نے اس کی سخت پرسش کی اور پہلی بار کان کھینچ کر دو چانٹے رسید کئے۔

وہ روتا دھوتا محبوب خاں کے ہاں پہنچا تو اس کی بیوی نے اپنی بادامی ساری کے آنچل سے اس کے آنسو پونچھے۔ منیر کے لئے یہ بالکل انوکھا تجربہ تھا لیکن اسے سوچ کر قدرے

اطمینان ہوا کہ اب جب بھی باوا کے ہاتھ کھلیں گے وہ اسی طرح محبوب خاں کے یہاں آجایا کرے گا۔ باوا اور ہم تو اکیلے رہتے ہیں اگر خالہ نہ ہوتی تو کیا ہوتا اور اس نے سنبھل کر قمیض کے کف سے ناک صاف کرتے ہوئے خیالوں کے صبا رفتار کی باگ کھینچی اور چوکی پر بیٹھ گیا۔
خالہ دیر تک اندر کوٹھری میں کھڑ بڑ کرتی رہی اور جب باہر آئی تو ایک سفالی میں میتھی کے دو لڈو رکھے تھے۔ منیر نے بڑی تیزی سے لڈو سفالی کے ہاتھ سے اچک لئے کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اگر کہیں وہ مردار سعیدن آنکلی تو چھینا جھپٹی میں یہ بھینی بھینی خوشبوؤں والے لڈو ایک تہائی تو یقیناً اس کے حصے میں چلے جائیں گے۔

کرایہ داری کو دیکھ کر خالہ نے کہا "ایک تو غیر کے بچے کو ہتھیائے ہوئے ہے اور اس پر یہ مار دھاڑ"۔ منیر اب ذہن کی سلیٹ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ لیا کرتا تھا۔

اب وہ رفیق کے ہاتھوں اکثر پٹ جایا کرتا۔ رفیق چاہتا تھا کہ مولوی رشید کے مدرسہ پر جا کر انہیں اچھی طرح سنائے۔ کچھ تو انہیں گرفت میں رکھنا چاہئے بچوں کو۔ خود اس نے منیر کی وجہ سے کتنی پابندیاں اپنے اوپر عائد کر لی تھیں۔ کتنی بیساکھی گزر گئی۔ دوستوں نے کیسے کیسے تقاضے کئے۔ اگر میرے چلن بھی خراب ہوتے تو لونڈا خدا جانے کیا کرتا۔

لیکن ہر نیا سورج منیر میں نئی حرارت بھر دیتا۔ اب وہ گولیاں تکئے کے خول میں چھپا دیتا مگر رفیق کو جب گولیوں کا سراغ ملتا تو منیر کی خاصی مرمت کر دیتا۔ پھر لٹو آیا۔ تاش کے پتے آئے اور مشاغل تاش کے پتوں کی طرح رنگ بدلتے رہے۔

"تم یہ حاضری کا رجسٹر دیکھ لو۔ تمہارا لڑکا پانچویں میں پڑھتا ہے۔ غیر حاضر بھی شاید ہی کبھی ہوتا ہو۔ چھٹی کے بعد یا کھانے کی چھٹی میں گولی کھیلتا ہو تو میں اسے کیسے روک سکتا ہوں"۔

رفیق جس قسم کی بات کر رہا تھا اس پر وقت کی بے شمار تہیں پڑ چکی تھیں اور وہ دن جب مولوی کی نظریں لڑکے کی سماجی اخلاقی اور ذہنی نشو و نما کو احاطے میں لئے رہتی تھیں بیکار اونگھتے ہوئے ماضی پرستوں کا خواب بن گئے تھے۔

تو لونڈا گیا کام سے۔ رفیق نے سوچا اپنا لڑکا ہوتا تو کسی طرح ٹھیک بھی کر لیتا لیکن یہ تو غیر کا ہے۔ پھر ایک اور آدمی اس کے اندر سے بول اٹھا تمہارا لڑکا تو رکشا کھینچتا رفیق میاں۔

اور اس دن جب محلے والے اسے چھڑانے لگے تو رفیق نے اپنی جیب سے بیڑی کا نیا بنڈل نکال کر سبھوں کو دکھاتے ہوئے کہا "بھیا تم لوگ بھی دیکھ لو یہ حضور کا نیا شوق ہے۔ فتح علی بھائی اب تم ہی بتاؤ میرا کیا قصور ہے اس میں۔ سوکھ جائے گا کلیجہ۔ ارے ابھی حرامزادہ ٹھیک سے گیارہ سال کا بھی تو نہیں ہوا ہے"۔

محلے والوں نے ڈانٹ کر کہا۔ "منیر رفیق سے معافی مانگو۔ بچہ ہے اب توبہ کر رہا ہے۔ چھوڑ بھی دو"۔

دوسرے دن شام کے وقت منیر کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ فتح علی نے لاعلمی ظاہر کی۔ محبوب خاں کی بیوی نے کھانستے ہوئے کہا مولوی صاحب کے یہاں سے آتے تو دیکھا تھا۔ محبوب خاں اپنے گودام پر تھا۔ وہ بھی بڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں سے وہ لوگ ظہرو کے یہاں گئے اور ایک کہرام سا سارے محلے میں مچ گیا۔ ظہرو سارے محلے والوں کو اکٹھا کر کے رفیق کو گالیاں دے رہا تھا اور بیچ بیچ میں ہائے میرا بچہ۔ ہائے میری پونجی کے نعرے بلند کرتا جاتا تھا۔

رفیق کے سینہ میں کسی نے ایک مکہ کھینچ مارا تھا۔ اس کا اعتماد، اس کا نصب العین، اس کی محنت چشم زدن میں ساری چیزیں آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ اس نے اس پھٹے ٹیوب کو پرے پھینک دیا جس میں سے کوئی تیس روپے کے نوٹ اور ریزگاری غائب تھی اور جو اس نے ایک دن پہلے سردار جوگندر سنگھ سے ٹائروں کی خریداری کے لئے سود پر لئے تھے۔

اپنا کچھ نہیں تھا۔ اب اپنا کچھ نہیں تھا، زندگی کے لق و دق صحرا میں رفیق اکیلا کھڑا تھا۔ تن تنہا کوئی مونس و غمخوار نہیں۔ کوئی رشتہ کوئی مقصد۔

اس نے دل پر پتھر کی سل کا بوجھ محسوس کیا۔ تنہائی، اجاڑپن، سناٹا کتنی اذیت تو اس نے شاید زینت کی ماں کی موت پر بھی نہیں اٹھائی تھی۔

ویرانگی، زندگی کی بے مروتی اور پھر اس نے پرانے ٹائر ٹیوبوں، رکشے کے ٹوٹے پھوٹے پرزوں پر نگاہ دوڑائی۔ اب ان ہی کا ساتھ ہے۔

رات اپنا سایہ ڈال چکی تھی۔ بازار میں روشنی پھیلی تھی۔ لیکن زندگی کی ہلچل اور شور سے بے نیاز رفیق ظہرو کے گھر جا رہا تھا۔ آج کلکتہ سے منیر کی چٹھی آئی تھی۔ منیر کا یہ خط فتح علی نے اسے پڑھ کر سنایا تھا۔ بھوا ہم نے تمہیں بہت دکھ پہنچایا ہے اور یہ کہ تم ہرگز یہ نہ سمجھنا کہ ہم تمہاری

مار کی وجہ سے بھاگ آئے ہیں۔ ماں باپ کی مار تو قسمت والوں کو (رفیق نے دل میں سوچا کہ کلکتہ جا کر تو لونڈا بڑا عالم بن گیا ہے) اور پھر وہ ٹیوب والے پیسے۔ (اور رفیق نے کہا چھوڑ فتح علی بھائی۔ پگلا لونڈا ہے جانے کیا کیا سوچتا ہے)۔ ہاں تو باوا ہم حبیبیہ ہوٹل میں نوکر ہو گئے ہیں۔ ابھی چالیس روپے کھانا ناشتہ ملتا ہے۔ ہم ہوٹل ہی میں سوتے ہیں جو کب کھلتا ہے کب بند ہوتا ہے یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ ہم نے تمہارے لئے بھی کام ڈھونڈھنا شروع کر دیا ہے۔

فتح علی پڑھتا رہا اور رفیق کو یوں محسوس ہوا جیسے آج وہ فتح علی ہو گیا ہے اور اس نے اپنے ہاتھ سے فتح ونصرت کا پرچم بلند کر دیا ہے۔ ''یہ میری محنت تھی فتح علی بھائی''، اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

ظہرو اس عرصے میں کئی خط منیر کو لکھ چکا تھا لیکن کلکتہ کی سمت سے کبھی کوئی کبوتر ظہرو کے گھر نہ اترا۔ زبیدہ کہتی، جانے موئے نے کیا کھلا دیا ہے کہ اپنی اولاد بھی ہمیں نہیں پہچانتی۔ ظہرو کو ایسا گمان ہوا جیسے وہ فصیل جہاں اس نے پہلی کمند پھینکی تھی زبیدہ ہی کے قلعے کی تھی۔ وقت کی دبیز چادر نے حقیقتوں کی راہ میں پردہ ڈال دیا تھا۔

رمضان ختم ہو رہا تھا کہ ایک دن صبح کو رفیق کی کوٹھری کے آگے ایک رکشا آ کر رکا۔ ایک چھوٹی اٹیچی، ایک چھوٹا بسترا، ایک ٹوکری۔

فتح علی نے وہیں سے ہانک لگائی۔ ''ارے رفیق دیکھو کون آیا ہے''۔

وہ منیر تھا پینٹ کے جوتے کو چرمراتا ہوا۔ رفیق نے بھی ہمیشہ اسے سفید پوش بنائے رکھا لیکن اب تو کچھ اور ہی رنگ تھے۔ رفیق کے ہاتھوں میں ایک جوڑا کپڑا دے کر اس نے کہا۔ باوا یہ اصلی چاند مارکہ لنگی ہے۔ پھر ٹوکری کھول کر کلکتے کے سوغات نکالے گئے۔ اناس، ناریل، کھجوریں اور سستی ٹافیاں۔ رفیق نے سوچا اپنا ہوتا تو اس سے زیادہ کیا کرتا۔ کلکتہ کے سوغات محلے میں بانٹے گئے جن سے یہ بات مشہور ہو گئی کہ منیر نے کلکتے میں اچھے دن گزارے ہیں۔

''باوا وہ ظہیر میاں کی کئی چٹھیاں ملی تھیں''۔

رفیق نے زبان کو دانتوں کے درمیان دبا کر کہا ''ارے بابو ظہیر میاں نہ کہا کر۔ ابا ہیں

تیرے"۔

"میں نے تو ان کے سب ہی خط پھاڑ دیئے، ہر خط میں تمہارے خلاف مجھے بھڑکاتے تھے"۔

رفیق نے کہا۔"ارے ڈیڑھ پسلی کا آدمی ہے اسے غصہ بہت آتا ہے، ہم تجھے وہاں لے چلیں گے؟

منیر نے ایک ایسے ماحول میں ہوش سنبھالا تھا جہاں عورت کا عدم وجود، بدسلیقگی، بدترتیبی اور بدصورتی کی نت نئی راہیں ہموار کر دیتا ہے۔ایک بکھری بکھری سی الجھی سی زندگی۔

تب ہی اسے ہوٹل کی کیچوے جیسی سویوں کے مقابلے میں ظہیر کے گھر کی سویاں ایک نئی لذت سے روشناس کرا رہی تھیں۔ وہ آج پہلی بار ظہیر کے گھر آیا تھا۔اور اب رفیق کی نظریں ظہرو کو یہ پیغام دے رہی تھیں کہ منیر عقل وشعور کی سرحدوں میں داخل ہو چکا ہے۔ چاہو تو اسے اپنا دست و بازو بنا لو وہ اب تمہارا ہی ہے۔ میرا کیا ہے۔

زبیدہ نے ڈھیر ساری بلائیں لے کر اسے کلیجے سے بھینچ لیا۔ یہ تجربہ اسے طمانیت بخش محسوس ہوا۔ وہ کچھ ایسی کیفیت سے دوچار تھا جسے کوئی مناسب نام دینا اس کے لئے دشوار تھا۔ دراصل ظہرو کی شخصیت اس کے لئے نئی نہیں تھی۔ رفیق کے کھردرے ہاتھوں نے اسے ہمیشہ باپ کے مشفقانہ جذبے کی حدت بہم پہنچائی تھی اور اگر ذہن کی تختی پر رفیق کے متعلق پڑوس کے لوگوں نے کچھ لکیریں کھینچی ہوتیں تو شاید اسے کبھی یہ علم بھی نہ ہوتا کہ رفیق محض ایک حادثہ تھا۔لیکن بادادہ تو ہمیشہ گھنی چھاؤں بنے رہے اور معا اس کا جی چاہتا کہ رفیق کے خلاف بولنے والوں کو عبرتناک سزائیں دے۔ان باتوں کا اس پر ہمیشہ یہی ردعمل ہوتا۔ پھر بھی ذہن کی سطح پر تند و تیز موجیں ابھرتیں، انتشار پھیلتا لیکن بالآخر فتح اس بات کی ہوتی کہ بدوا سے الگ ہو کر صرف حال ہی حال رہ جاتا ہے۔ پر منیر آج تک محبت کی اس قسم سے ناآشنا تھا جو سوکھی کھیتوں کو ہری کر جاتی ہے جس سے حیات کے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔ ایک بے پناہ سکون، آبشار کے کنارے بیٹھنے کا جادو۔

"بیٹے یہیں آ جاؤ۔ ہم سب مل کر کام کریں گے۔ غیر پھر غیر ہوتا "۔

اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کہیں دور سے یہ آوازیں آ رہی ہیں۔ آخر ظہرو کے خط نے یہ

اثر کیوں نہیں کیا تھا۔ لیکن باوا۔

''نہیں مجھے ان ہی کے ساتھ جانا ہے''۔

اس تمام عرصے میں ہر لحظ وہ ایک نئی منزل کی طرف بڑھتا گیا اور ہر نئی منزل اس کے سامنے بہت کچھ سوچنے اور سمجھنے کا مواد فراہم کر دیتی۔ کلکتہ کی وسیع و عریض دنیا میں کام کی کوئی کمی نہیں تھی اس لئے ایک ہوٹل چھوڑنے کے بعد دوسرا ہوٹل۔ کبھی بنیاین کا کارخانہ کبھی کوئی بیکری۔ ہاتھ پاؤں سلامت ہیں تو کام کا کیا غم ہے۔ رفیق جب بھی اسے سمجھا کر لکھتا کہ ایک جگہ جم کر کام کر تو اسے یہی جواب ملتا۔

فرصت ملتے ہی اس نے زبیدہ کے خط کا جواب دے دیا۔ ظہرو نے اسے کئی خط لکھے تھے لیکن اس نے کبھی بھی جواب نہیں دیا تھا۔ زبیدہ کو یوں محسوس ہوا کہ ٹنڈ منڈ درخت میں ہرے پتے آنے لگے ہیں اور زندگی کے اجاڑپن کی عمر ڈھل رہی ہے۔

رجب علی اسے بتا رہا تھا۔ ''میں تو کل ہی جنتا سے آیا ہوں''۔

''کہاں کی ہے وہ؟''۔ ''یہ تو پتہ نہیں یار لیکن کسی دیہات ہی کی ہے خوب گہرے گہرے رنگ کی ساری پہنتی ہے۔ رفیق چچا خوش ہیں''۔

زندگی کے اس موڑ پر آ کر باوا کو ایک ساتھی کی ضرورت پیش آ ہی گئی جب تک میں باوا کے ساتھ رہا باوا نے اپنا سارا پیار اپنے دل کے ولولے میرے اوپر صرف کر دیئے میرے آنے کے بعد یقیناً انہیں گھٹن محسوس ہوتی ہوگی۔ چلو باوا نے جو کچھ کیا اچھا ہی کیا۔ کام کرنے والوں کو سکون نہ ملے تو . . . .

رفیق کے خط آتے رہے لیکن کہیں بھی اسے یہ محسوس نہیں ہوا کہ یہ رشتہ جو محض ایک ریت کی دیوار کے سہارے کھڑا کیا گیا تھا، ڈھ چکا ہے۔ وہی استحکام تھا، وہی پہلے والی بات، وہی نصیحتیں۔

ان دنوں کلکتہ پر عفریت سے منڈلا رہے تھے۔ آدمیوں کے ہاتھ پاؤں جل رہے تھے۔ شعلوں کی زبان جل رہی تھی۔ اتنے بڑے شہر میں اس نے بہت سے تجارتی ادارے دیکھے تھے۔ کچے اور پکے چمڑے کی منڈیاں دیکھی تھیں۔ مذبح دیکھے تھے لیکن یہ لہو کا بیوپار اس کی زندگی میں ایک نیا تجربہ بن کر آیا تھا۔ کئی دنوں تک وہ اپنی کوٹھری میں رجب علی کے ساتھ

بندر ہا۔ رجب علی کو کام مل گیا تھا اور دونوں نے مل کر یہ کوٹھری کرایہ پر لی تھی۔

جب ڈاک کا نظم بحال ہو گیا تو اسے ایک ساتھ زبیدہ اور رفیق کے خط ملے۔ دونوں نے ایک ہی بات لکھی تھی کہ کلکتہ کے حالات اچھے نہیں ہیں تو پھر گھر چلے آؤ۔ زبیدہ کی چٹھی کے حاشیے پر ظہیر کی مختصری تحریر تھی کہ خط دیکھتے ہی چلے آؤ ورنہ ہم خود تمہیں لینے چلے آئیں گے۔

خیالوں کی راہیں آج کتنی پر پیچ تھیں کتنے گڈھے تھے، کتنی ڈھلان تھی، کتنے ٹیڑھے میڑھے تھے یہ راستے۔ آخر وہ کہاں جائے اور کیوں جائے۔

لیکن شام ہونے پر کسی نے ٹہوکا مار کر کہا "چلو" اور اس نے فیصلہ کن انداز میں رجب علی سے کہا۔ "ہم آج ملک جارہے ہیں"۔

رکشے والے کو پیسہ دے کر اس نے کوٹھری میں جھانک کر دیکھا۔ صبح آنے والی سبھی گاڑیاں آچکی تھیں لیکن رفیق اب تک کھری کھاٹ پر کمرے کے دھوئیں سے بے نیاز سو رہا تھا۔ ہری سرخ پاڑی والی نے کون ہے کون ہے کی صدا لگائی اور منیر نے گویا چیختے ہوئے کہا۔

"بابا ہم ہیں، سلام علیکم"۔

تو تم منیر ہو۔ "سلام خالہ"۔

اس خود ساختہ رشتے کے جوڑے پن نے شاید عورت کے منھ کا مزا بگاڑ دیا اور اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار پیدا ہوگئے۔

رفیق نے کھاٹ سے اٹھتے ہی اسے لپٹا لیا۔

"کتنا دبلا ہو گیا ہے بابو۔ بس کلکتہ بھی کوئی شہر ہے۔ گوشت کی جگہ چھیچھڑے ملتے ہیں، دودھ تو کلکتہ میں غریب آدمی کی چیز ہی نہیں ہے"۔

"لیکن بابا تم تو ملک میں رہتے ہو۔ یہاں مشینیں کل کارخانے اور زندگی کی بھاگ دوڑ نہیں ہے اس پر تم نے یہ حال بنا رکھا ہے۔ یہ تمہارے چہرے پر چھوٹی چھوٹی جھریاں صاف ہوتی ہوئی چندیا جس پر کنگھی کی کتنی بہتیں جم چکی ہیں یہ گرتی ہوئی صحت"۔

رفیق نے اس کی نگاہوں کے شکایت آمیز لہجے کو بھانپ لیا۔

"کچھ نہیں بابو بس معمولی سا بخار آگیا تھا"۔

ہاتھ کے اشارے سے اس نے کہا۔ "بابو"۔

رفیق کو صحیح رشتہ بتانے میں دقت ہو رہی تھی۔

''ہاں خالہ کو آتے ہی سلام کیا تھا''۔ منیر نے رفیق کی مشکل آسان کر دی۔

کھانا کھا کر رفیق تو رکشا لے کر چلا گیا اور وہ کھاٹ پر لیٹے لیٹے اونگھ سا گیا۔ اس نے سنا خالہ کسی سے سرگوشی کے انداز میں کہہ رہی تھی''۔ ویسے ہی بازار مندا تھا اس پر ایک اور آ گیا''۔

رات کو رفیق آیا تو اس کی بیوی نے بتایا کہ دن ڈھلے منیر اپنا سامان لے کر چلا گیا۔ کہہ گیا ہے کہ ہم ابا کے یہاں جا رہے ہیں۔ باوا سے کہہ دینا۔ ہم پھر آئیں گے۔

رفیق کچھ مضطرب سا ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ ظہرو کے یہاں جائے، جا کر منیر کو لے آئے لیکن کسی نے کہا ارے گھر ہی تو گیا ہے اپنے۔ لیکن گھر تو یہی ہے، یہ تو ڈھکوسلہ ہے۔ اور یہ آخری آواز نہیں تھی۔ بہت سی ملی جلی آوازیں آئیں۔ اس کی بیوی کی کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ، دیگچی کے ڈھکن کی آواز، کرچھل کی آواز، اور پھر ایک ایسی آواز جس کی کوئی لے نہیں ہوتی ہے پھر بھی اپنا مدعا بیان کر جاتی ہے۔ بازار ڈھیلا ہے۔ رکشے کی چال ڈھیلی ہے۔ لیکن اس کے کیا معنی؟ خیر سویرے سہی اور پھر جیسے ساری آوازیں نیند میں ڈوب گئیں۔

آنگن کے بیچ الگنی پر ظہرو کی لنگی سوکھ رہی تھی۔ آخری پہر کا ڈھلتا ہوا سورج نڈھال نڈھال سا مغرب میں اپنا سفر طے کر رہا تھا اور دھوپ دبے پاؤں دور جا کھڑی ہوئی تھی۔ چولہے کا دل بجھا بجھا سا تھا بس ایک سست رفتار سی ہانڈی چڑھی تھی۔ زبیدہ ڈبے بنا کر اٹھی تھی اور کنویں میں بالٹی ڈال رہی تھی کہ کسی کے کھنکھٹانے کی آواز آئی۔

''کون ہے''۔ ہم منیر ہیں اماں۔ زبیدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ بہت سے جذبات بہت سے تاثرات۔ آج سویرے ہی سویرے ٹھاٹھ پر کوے نے تمہارے آنے کی خبر دی تھی۔

''بڑی نکل آئی ہے۔ اپنا گھر چھوڑ چھاڑ کر اتنی دور رہتے ہو''۔

اس دفتر پر گرد و غبار کی تہہ جم گئی تھی۔ اسے جھاڑ پونچھ کر صاف کیا جا رہا تھا۔ تمنائیں اور حسرتیں۔

''منیر ہم لوگ کبھی یاد آتے تھے کلکتے میں''۔ کئی طوفانی لہریں اٹھیں اور اس نے نظر

چرانے ہی میں عافیت محسوس کی۔ شاید جب اپنی کوکھ کے بچے نہیں ہوتے تو محبت کا کارواں منھ اٹھائے صحراؤں میں بھٹکتا پھرتا ہے جہاں اسے کوئی نخلستان ملتا ہے وہاں وہ خیالوں کی بھول بھلیاں اسے جانے کہاں سے کہاں پہونچا دیتیں۔

تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں

یہ گمان ہوتا تھا کہ ظہرو کو بیٹے کے آنے کی خوشی سے زیادہ فتحمندی کا احساس تھا۔ ایک کشمکش جو ایک عرصے سے منیر اور رفیق کے مابین جاری تھی اسے وہ حق اور باطل کی کشمکش سے تعبیر کرتا تھا۔ حالانکہ واقعات کچھ اور تھے لیکن رفیق کی بار بار کی صفائی کے باوجود ظہرو کو یہ توضیحات ہمیشہ سطحی اور بے معنی سی دکھائی دی تھیں۔

رفیق اس درمیان کئی بار منیر کو لینے آیا اور منیر اس کے ساتھ ہو بھی لیا لیکن بس دو چار گھڑی رہ کر واپس چلا آیا۔

ظہرو کے یہاں ایک متنفس کا اضافہ ایک غیر معمولی بات بن گیا گو عام حالات میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ ظہرو اور زبیدہ زینے پر کھڑے دیر سے اس آدمی کی راہ دیکھ رہے تھے جسے ایک نہ ایک دن انہیں گھر کی چابیوں کا گچھا سپرد کرنا ہے۔ یہ چارپائی۔ یہ چوکی۔ یہ برتن۔ یہ کپڑے۔ یہ زیور اور وہ منیر تھا جو ویرانوں میں پندرہ سولہ سال گزار کر گھر کی چھت تلے آیا تھا جہاں اس کا نحیف و زار باپ تھا جو عمر کی غلط سمت کی طرف چل نکلا تھا جس کے چہرے پر سلوٹیں نمایاں ہو چکی تھیں، بالوں پر روپہلے کچھے نکل آئے تھے جیسے ساری عمر سموم کی سختیاں جھیلی ہوں۔

کارڈ بورڈ کا بنڈل رکھتے ہوئے ظہرو نے نئے حوصلوں اور نئے جوش کے ساتھ کہا۔ ''پہلے ہمارے چار ہاتھ تھے اب ہمارے چھ ہاتھ ہیں، ان چھ ہاتھوں سے ہم زیادہ سے زیادہ ڈبے بنائیں گے''۔

پھر وہ مدرسہ چلا گیا اور منیر دن بھر گلیوں میں آوارہ گھومتا رہا۔ دوپہر کو لوٹا تو کھانا کھا کر چھپر کے نیچے کھاٹ بچھا کر سو رہا۔

ظہرو آیا تو صرف تین چار درجن ڈبے تیار تھے۔

''تو کیا منیر نے.........''

"اب کیا منیر سے ہم ڈبے بنواتے۔ پہلی بار تو ہمارے گھر آیا ہے"۔

ظہورو نے بیڑی کا ایک لمبا کش لیا۔ "لڑکے کو کہیں جانے دو۔ بس یہیں برس روز جم جائے تو ہم کہیں اس کی بات چلائیں"۔

لیکن منیر اب کلکتہ کے شب و روز دیکھنے کے بعد یہاں کچھ عجیب سی بیگانگی محسوس کر رہا تھا۔ ٹراموے، بسیں، رکشے، ٹھیلے، بھیڑ کی بے تکان باتیں، ایک چائے سنگل، ایک چائے ڈبل، ایک زعفرانی قورمہ، چار چپاتیاں اور صاحب کے لئے سلاد لاؤ۔

یہاں اکتا دینے والے دن تھے، اکتا دینے والی راتیں تھیں۔ مشینیں وقت کے سینے چیر کر نکل جاتی ہیں لیکن گھریلو چکی تو ایسی ہوتی ہے کہ خود وقت کو رک رک کر اس کی مزاج پرسی کرنی پڑتی ہے۔

انہیں دنوں اسے محبوب خاں کی بیوی کی شدید علالت کی خبر ملی۔ خالہ بستر سے لگ چکی تھیں۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ انہوں نے اسے رخصت کیا۔ جاتے سے اس نے رک کر چولہے کی طرف نظر دوڑائی، وہاں شلوار اور دوپٹہ میں بہار نے اپنا ڈیرا ڈال دیا تھا۔ شہابی سا رنگ، صندلی باہیں، سیاہ گھٹائیں دور دور تک جسم کا احاطہ کئے بے چین بے چین سی نگاہوں کا آہو۔ بادلی کہاں ہے؟۔

باولی۔ گذرتے ہوئے کارواں کی گھنٹیاں تادیر اس کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ پھر رجب علی کا خط ملتے ہی وہ کلکتہ کے لئے روانہ ہو گیا۔

اور جب کلکتہ میں دن کا طوفان تھم جاتا اور رات کی آنکھیں بوجھل ہونے لگتیں تو وہ اپنی کوٹھری میں واپس آتا اور گو کہ اس سے اس کا جسم ٹوٹتا ٹوٹتا معلوم ہوتا لیکن اس حال میں بھی یادوں کے قافلے غباروں کی اوٹ سے نکل کر اس کے سامنے سے گزر جاتے اور اس کا جی چاہتا کہ وہ اس الف لیلوی شہر کو پھر ایک بار دیکھ آئے جہاں رات کی رات ایک الجھے بالوں والی لڑکی کی جگہ ایک شاخ خوش خرام نے لے لی تھی۔ وہ اب ایک ایسی منزل پر آ چکا تھا جہاں ہر نئی ساعت ایک نئے تجربے کو جنم دیتی تھی۔ بہت سے انجانے جذبات، بہت سے غیر متعارف ہیجانات اس کی تنہائی میں مخل ہوتے لیکن اب یہ خلل اندازیاں کافی کیف آور ثابت ہوتیں۔ چھوٹی بڑی موجوں کا پرشور سا سلسلہ۔

لیکن رجب علی کے بار بار کے اصرار پر بھی منیر نے اس گمشدگی کے راز کو سینے میں دبا کر رکھنے ہی میں عافیت محسوس کی۔ رجب علی کو یہ بات بڑی ناگوار گزری۔ کلکتے کی اس دنیا میں دونوں اپنے غم اور اپنی خوشیاں آپس میں برابر برابر تقسیم کر لیا کرتے تھے، کھانے اور کپڑے میں بھی وہ حصے دار تھے لیکن آج منیر اس راز کو سینے کے نہاں خانے سے نکالنے کا روادار ہی نہیں تھا۔

رفیق کے خط برابر آتے رہے پھر خالہ کو ولادت ہوئی تو منیر نے بچے کے لئے سلی سلائی فراکوں اور جانگھیوں کا ایک پارسل بھی بھیج دیا۔ اس پر رفیق نے اسے نصیحت کا ایک لمبا چوڑا خط بھی لکھا کہ اس قسم کی فضول خرچیوں سے پرہیز کرو۔ دو پیسے بچاؤ گے تو تمہاری شادی میں کام آئیں گے۔

"کیا بادا کو سراغ مل گیا"۔

زبیدہ اسے بار بار لکھتی کہ چلے آؤ اور یہیں اپنا کام کرو۔ اور اچانک وہ کوہ ندا کی آواز پر دوڑ پڑا۔

پھر وہ اس چھوٹے شہر کی پراسرار زندگی میں الجھتا رہا۔ جہاں ایک مہیب سناٹا گلیوں اور کوچوں کے چکر کاٹتا رہتا۔ اگر یہاں ایک پتلی سی ٹوٹی پھوٹی سڑک جس کے دونوں جانب دوکانیں تھیں نہ ہوتی تو یہ ٹھٹھری سمٹی زندگی کفن پوش دکھائی دیتی۔ سڑک پر جا بجا کسیروں کی کھٹ کھٹ اور ٹھٹھیروں کی ٹھک ٹھک سے یہی گمان ہوتا تھا کہ یہاں اب تک تہذیب کا وہی سورج چمک رہا ہے جو کلکتے والوں سے مدتوں پہلے چھن چکا ہے۔ رکشے اور سائیکل کی گھنٹیاں، موٹر کے ہارن، آٹو رکشا کی پھڑپھڑاہٹ یہ سب تنی ہوئی لوہے کے دل کی دھڑکنیں چیختے شہر کی وہ بلند و بانگ آواز، وہ پرشور رفت، وہ خلقت کا سمندر یہاں کہاں تھا۔

یہاں تو گلیوں اور کوچوں میں چلتے ہوئے اسے اکثر ایسا محسوس ہوتا کہ بس صرف اس کا سایہ اس کے ساتھ چل رہا ہے۔ ورنہ دور دور تک کوئی نہیں ہے، کوئی نہیں ہے اور اب جب کھپریل پر بیٹھ کر کوا کائیں کائیں کرتا تو یہ کائیں کائیں ارد گرد کے سبھی گھروں کے کونے کونوں کی سیر کراتی اور جب مرغ اس کے آنگن کے ڈربے میں رات کے ڈھلنے کی خبر دیتا تو سارا محلہ نیند کی منزلیں طے کر لیتا اور محلے کی مسجد کا موذن اعلان کرتا کہ نماز نیند سے کہیں بہتر

ہے۔اور جب تاڑ بن کے پاسی اپنے تاڑ پر چڑھتے تو سارے محلے والے ان کی چڑھائی، پتوں کے درمیان ان کی تلاش معاش اور پھر ان کی کمر پر لگی لبنیوں کو جو بتدریج نیچے آتی تھیں بخوبی دیکھ سکتے تھے اور یہ مناظر چھوٹے بچوں کو حیرت واستعجاب میں گم کر دینے کے لئے کافی ہوتے اور وہ منھ سے عجیب عجیب آوازیں نکالنے لگتے۔

اور پھر اس پراسرار سے ماحول کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں تھیں جو جا بجا بکھری پڑی تھیں۔اس کا اپنا گھر تھا جہاں وہ ایک طویل سا چکر کاٹ کر پہنچ گیا تھا۔یہ گھر اس کا اپنا تھا۔ یہاں وہ اپنے حق کی بات کر سکتا تھا۔اس گھر میں اس کا نحیف سا باپ تھا جو بانس جیسے جسم پر بند گلے کی گاڑھے کی قمیص اور پائجامہ پہنتا تھا اور جو زندگی کے چاک کو بڑی احتیاط اور بڑی تندہی سے چلانے میں مگن تھا جس کی خواہش تھی کہ منیر بھی اسی چاک کو چلانے میں اس کا ساتھ دے جسے وہ دیر سے چلا رہا ہے اور جسے چلاتے چلاتے اس کے ہاتھ شل سے ہونے لگے ہیں اور اعصاب میں ایک تناؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگی ہے اور اس کی گرتی ہوئی صحت منیر کے آگے دست سوال دراز کر دیتی۔زبیدہ اس سارے مسئلہ کو اسی طرح دیکھتی کہ یہ گھر ہے، آج یہ چھتیں یہ درودیوار ہمارے ہیں لیکن کل ہم اپنی اپنی منزلوں پر روانہ ہو جائیں گے تو منیر اس کا اصل مالک ہماری جگہ لے گا۔ہماری زندگی کا اصل مقصد تو گھر کے چراغ کو روشن رکھنا ہے اور پھر چراغ سے چراغ جلنے کا عمل اور ایک خفتہ خواہش اس کے دل میں شہنائیاں بجانے لگتی۔

لیکن ان باتوں سے بے نیاز منیر کے سامنے ایک حیرت ناک کہانی تھی کہ صبح اٹھتے ہی وہ رات کا منظر غائب ہو چکا تھا۔وہ میلی کچیلی باولی سی لڑکی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ایک پری وش نے اس لڑکی کو کہاں چھپا دیا تھا۔وہ دوست تھی یہ رہزن تھی جو اسے بقید ہوش وحواس محبوب خان کی انگنائی میں کھینچ لائی تھی۔شہزادی نے غربت کی چادر میں دن کاٹے تھے اور اب ماں باپ کی یہ خواہش تھی کہ آسمان سے اڑتا ہوا کوئی شہزادہ اچانک ان کی انگنائی میں اتر آتا اور پھر اسے کاٹھ کے گھوڑے پر بٹھا کر فضائے بسیط میں گم ہو جاتا۔

"تو وہاں نہ جایا کر بھیا۔محبوب خاں کی عورت کو چھوت کی بیماری ہے"۔رفیق صاف بات کرنے سے احتراز کر رہا تھا۔

لیکن پھر اسے کوئی کھینچ کر لے جاتا۔کوئی غیبی طاقت، جو بہت ہی مضبوط تھی اور جس

کے آگے اس کے سارے ارادے سرد پڑ جاتے تھے۔ یہاں زندگی میں اکتا دینے والی یکسانیت تھی، پریشان کن ٹھہراؤ تھا۔ کوئی تڑپ نہیں تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ شہر سے زیادہ ہیجان تو اس کے دل میں بپا تھا جسے قوس قزح کے رنگ ایک عارضی سا سکون بخش دیتے جو افق سے اتر کر محبوب خان کی انگنائی میں آ گئے تھے۔

ظہیرو اس کی آوارہ گردیوں کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتا تھا مزدور کا بچہ اور یوں دن بھر سیر سپاٹے میں بسر کرے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کے خوابوں کا فانوس فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا ہے۔ لیکن جلد ہی دھند چھٹ جاتی اور اسے فانوس اپنی جگہ پر دکھائی دینے لگتا۔

سنبھل جائے گا وقت آنے پر۔ نیک بخت کا بھی یہی خیال ہے۔

رفیق ظہیرو کو ڈیوڑھی میں بیٹھا سمجھا رہا تھا۔ ''یہ راستہ کانٹوں سے بھرا ہے۔ شاید کوئی بھول چوک ہو جائے کہو تو میں محبوب خاں سے بات کروں''۔

لیکن ظہیرو تو طوفانی موجوں میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ نواب نصیر پر تنفس کا دورہ پڑا تھا۔ ذرا دم لے کر بولے، ارے کمبخت اپنی بے وفا ماں کی نشانی کتنی بار تجھ سے کہا۔ جب لونڈا سیانا ہو جائے تو بیشک تم اسے لے سکتے ہو۔ پانی کی سطح پر کسی نقش کو دوام نہیں۔ لیکن یہاں تو ہر چیز زندہ تھی، ہر چیز تازہ تھیں محرومیوں کا زخم تازہ تھا اور ان میں سے رستا ہوا لہو تازہ تھا۔

کسی نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

''ضرور بات کرو رفیق بھائی''۔

لیکن یکا یک الف لیلی کی داستان کا دیو دھوئیں کے بادلوں سے نمودار ہوا اور اس نے کھلے لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اگر تم نے لڑکی کا رشتہ ایسے لڑکے سے کیا جس کے باپ تک کا کوئی اتہ پتہ نہیں ہے تو سمجھ لو کہ ساری برادری میں ناک کٹ جائے گی۔ پٹھان بڑے عزت دار ہوتے ہیں۔ کون ملے گا پھر تم سے، تمہارے یہ بال دھوپ کی تمازت سے تو سفید نہیں ہوئے ہیں اور یہ دیو محبوب خاں کا بھائی حمید خاں تھا۔

ساری داستان اس طلسم میں بھسم ہو گئی اور دروازے بند ہو گئے۔

ظہیرو کو یوں محسوس ہوا کسی نے اس کی ننگی پیٹھ پر کوڑے مارے ہوں۔ کتنی اذیت ہوتی

ہے ٹیڑھی بنیاد پر عمارت کھڑی کرنا کچھ آسان تو نہ تھا۔
رفیق کہہ رہا تھا۔ ''کیا دھرا ہے اس لڑکی میں۔ پھر ذرا سوچ کہ اس کی ماں کو پرانی بیماری ہے''۔ لیکن ظہرو نے کچھ نہیں کہا اس کے چہرے پر تو گویا شام کا سا سکوت طاری تھا۔

''لڑکیاں ایک ڈھونڈیں گے ہزار ملیں گی''۔ زبیدہ اسے سمجھا رہی تھی۔

دوسرے دن ظہرو نے اسے دیر تک کارڈ بورڈ کے ڈبوں میں الجھائے رکھا، وہ چاہتا تھا کہ اسی طرح وہ دوسری راہوں پر لگ جائے۔ منیر کو اس غیر دلچسپ کام میں ذرا بھی کشش نہیں محسوس ہوتی تھی۔ اسے تو اب ہر چیز نکمی اور ست سی دکھائی دیتی تھی۔ یہ گھر، یہ ماحول۔ یہ بانس کی شکل کا باپ (جانے وہ بھی ہے یا نہیں؟) جو لڑکپن اور جوانی کے سنگم پر ملا ہے۔

سارے دن کھری چارپائی پر پڑے پڑے اس کی پیٹھ پر رسیوں کا جال سا بن جاتا۔ اسے اب زبیدہ کی تسلیاں بھی ناگوار ہوتیں۔ ہر چیز اسے زہر بھری دکھائی دیتی۔ پیپل اور بکائین کے خشک پتے آنگن میں فرش بچھائے پڑے تھے، وہ بھی تو ایک خشک سا آوارہ پتہ تھا جو ٹوٹ کر سارے میں اپنا مقام تلاش کر رہا تھا۔ لیکن نہ کوئی جادہ تھا نہ کوئی منزل تھی۔ کتنے الجھاوے تھے، کتنی پیچیدگیاں۔

اور جب دن کا سورج جھک کر آخری سفر کے لئے کمر باندھ رہا تھا اور دھوپ دیوار کے سہارے لگی کھڑی تھی تو اس نے سامان باندھتے ہوئے اپنی ماں سے کہا۔

''میں آج شام کی گاڑی سے کلکتہ جا رہا ہوں۔ ابا سے کچھ پیسے دلوا دو''۔

ظہرو آیا تو اس نے درشتگی سے کہا۔ ''یہاں کیا پیسے پھلتے ہیں کیا ضرورت ہے کلکتہ جانے کی؟''

''لیکن تم تو بڑے باپ بنتے ہو''۔

''حرامزادہ بدزبانی کرتا ہے''۔ زبیدہ کے لاکھ منع کرنے پر بھی ظہرو ڈنڈا لے کر دوڑ پڑا۔

منیر گلیوں میں بے تحاشا بھاگتا چلا گیا۔

رات گئے تک سارا گھر خاموشی کی گود میں اونگھتا رہا۔ پھر انہوں نے اس کی چارپائی تلے سے پرچیوں کا ڈھیر اکٹھا کیا۔ زبیدہ کی آنکھوں میں سرخ ڈورے سے پڑ گئے تھے۔ پتہ

نہیں اس کو کس سے شکایت تھی، ظہرو سے، منیر سے یا

"تمہارے ابا اماں رکنے کو کہتے ہیں تو کچھ دن یہیں ٹھہر جاؤ"۔

رفیق اس کے بالوں پر اپنا ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"باوا! مجھے مجبور نہ کرو۔ میں اپنے شہر جاؤں گا"۔

سید صاحب نے کھنکھارتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں ظہرو کیا قصہ ہے"۔

"سید صاحب یہ خدائی خوار اپنی بے وفا ماں کی نشانی قرعہ نکالتا ہے کہ اس کا باپ کون تھا۔ کبھی آپ نے آج تک یہ باتیں سنی ہیں۔ کمبخت سمجھ لے کہ تینوں تیرے باپ ہیں"۔

اور منیر نے جھنجھلا کر کہا۔ "ابا خدا کے لئے مجھے گالی نہ دو"۔

جلتا ہوا جنگل

دراصل اس مکان کے سکوت نے اسے پراسرار بنا دیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ مکان ایک ایسی سڑک پر کھڑا ہے، جو بہت دور سے آتی ہے، اور بہت دور تک جاتی ہے، جس پر زندگی ہمہ وقت شور مچاتی رہتی ہے، شریر بچوں کی طرح۔ ٹرکیں، موٹریں، اسکوٹریں، سائیکلیں اور پیدل چلتے ہوئے لوگ۔ لاؤڈ اسپیکر کی چیخ پکار۔

مگر مکان چپ چاپ دم سادھے کھڑا رہتا ہے، جیسے پچھلی رات اس نے کوئی بڑا بھیانک خواب دیکھا ہے۔ جیسے کسی حادثے نے اس سے سب کچھ چھین لیا ہے، صرف زندہ سانسیں اور پتھریلی آنکھیں رہ گئی ہیں، جو ایک ہی جلوے کو دیر سے دیکھتی چلی آ رہی ہیں۔ سانس کی آمد و رفت اور بس۔ ہر عضو ایک نقطے پر آ کر ٹھہر سا گیا ہے۔ نہ مسکراہٹیں، نہ قہقہے، نہ تالیاں، نہ ماتم، نہ آہ و فغاں۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سارے تاثرات نچوڑ لئے گئے ہیں۔

ویسے دیکھئے تو یہ ایک بڑی عمارت ہی کہلائے گی کہ ایک سمت مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا برآمدہ (جس کا رنگ اگر بہت تازہ نہیں ہے، تو کچھ بہت پرانا بھی نہیں ہے) سرگوشیوں میں کہہ رہا ہے" آپ جو سوچ رہے ہیں وہ غلط ہے، ہم ہر برس دو برس بعد تازہ کر دیئے جاتے ہیں"۔ دروازے جن پر کچھ نیا اور کچھ قدرے پرانا روغن چڑھا ہے، یہاں سے وہاں تک بند پڑے ہیں۔ دوسری جانب اس سمت سے اس سمت تک پھیلی ہوئی کھڑکیاں ہیں جو ہمیشہ بند پڑی رہتی ہیں۔ اگر کبھی کھلتی بھی ہیں، تو اس طرح کہ باہر والوں کو صرف جالیاں ہی جالیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں سے وہاں تک، نہ نگاہوں کے آہو، نہ دھڑکتے دل کی دستک،

نہ چہرے کی گرم تحریریں، تیسری طرف بھی بند کھڑکیاں ہی دکھائی دیتی ہیں اور چوتھی طرف بلند وبالا دیواریں ہیں، جن کے قدموں میں ایک اندھی اور متعفن گلی لمبی لمبی سانس لیتی رہتی ہے۔ گلی کہ جس میں صرف تعفن اور غلاظت کے قدم آتے ہیں۔ انسانی قدموں کا اس گلی میں اب تک کوئی سراغ نہیں ملا ہے۔ گندی نالیوں کا جال، عمارت کے گرتے ہوئے نالے، کوڑا کباڑا، کتے بلیاں، چوہے، چھچھوندریں اور کاک روچیں۔

ایک اور عمارت اس سے ملحق کھڑی ہے، بے حد وسیع و عریض، جس نے آگے جا کر اس عمارت کے بھی روزن و در اور سبھی روشندانوں کو بند کر دیا ہے، اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ عمارت کا ایک بازو شل ہو گیا ہے۔ یہ عمارت جو اس سے متصل ہے، رنگ و روغن سے لیس ہے۔ دیکھنے میں لگتا ہے کہ ابھی کھلکھلا کر ہنسنا شروع کر دے گی۔ سمندر کے ساحل پر امنگوں بھرا دل لئے دور تک دوڑتی چلی جائے گی۔ ابھی زور زور سے ہچکیوں کے ساتھ رونے لگے گی، پھر دھیرے دھیرے اس کی ہچکیاں بھی تھم جائیں گی، اور پھر وہ آنسو پونچھ کر شاداں و فرحاں سی استفسار کرے گی۔ کیا ہوا؟ کیوں یوں گھور گھور کر دیکھ رہے ہو''۔ اور دیکھنے والا یوں بھونچکا ہو کر اسے دیکھتا رہ جائے گا کہ'' کیا حیات کی، مچلتی ہوئی حیات کی یہی ادائیں ہوتی ہیں''۔ گہرے رنگ میں ڈوبی ہوئی عمارت جو بہت بلند ہے، کئی منزلہ ہے۔ اسے دیکھ کر کبھی کبھی یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ اپنی ملحقہ عمارت پر ٹوٹ پڑے گی، اس پر بکھر جائے گی۔ اسے اپنے گہرے رنگوں میں ڈبو دے گی۔

لیکن دونوں عمارتوں کا الگ الگ وجود ہے۔ رنگوں والی عمارت اسے اپنے رنگ میں ڈبونا چاہتی ہے، مگر ڈبو نہیں پاتی۔ اجڑی عمارت سمجھتی ہے کہ میں کسی بھی لمحے ڈوب جاؤں گی، مگر نہیں ڈوبتی، شاید اس کا خوف اس کا دفاع کرتا ہے، اور رنگوں والی عمارت کا غرور اس کے ارادے کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے۔ ایک عجیب کشمکش ہے، جو آہستہ رو رہتی ہے، جو قدرے تیز ہو جاتی ہے، جو بہت تیز رو ہو جاتی ہے، اور پھر الٹے قدموں قدرے تیز رو ہو کر آہستہ رو ہو جاتی ہے۔

دونوں بہت دور سے سفر کرتی ہوئی آرہی ہیں۔ اس موڑ پر پہنچ کر ایک نے اپنا سب کچھ نوچ کر پھینک دیا ہے۔ (یہ بات یقین کے ساتھ کیسے کہی جا سکتی ہے، ممکن ہے کسی اور نے نوچ

پھینکا ہو) تو دوسری نے خود کو رنگوں میں ڈبو دیا ہے۔ دونوں کے آگے پیچھے سفر کی داستانیں ہیں۔ اگر گلے میں باہیں ڈال کر رازدارانہ انداز میں پوچھیں تو ایک سفر کا حال خوب لہک لہک کر سنائے گی، تو دوسری بہت دور تک ایک خوشگوار سفر کی تفصیلات میں کھوئی رہے گی، لیکن پھر ایک نکتے پر پہنچ کر وہ خود پوچھے گی، تم ہی بتاؤ اس کے بعد کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ بس اتنا معلوم ہے کہ کچھ ہوا ضرور۔

سنتے ہیں اس سڑک نے اپنی زندگی میں (اور اس زندگی کے متعلق کوئی شخص پورے اعتماد کے ساتھ کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتا)، بہت سے ایسے حادثے دیکھے ہیں کہ کچھ عمارتیں بولتے بولتے ایکدم سے چپ ہو جاتی ہیں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اب بولنے کو کچھ نہیں رہ گیا ہے، بالکل ہی بے ربطگی سے ختم ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے (ممکن ہے دل نے اچانک یہ حکم جاری کیا ہو کہ اک ذرا ٹھہر کر)۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی دیر سے چپ چاپ کھڑی کھڑی یکا یک روشنیوں میں، رونقوں میں اور رنگوں میں ڈوب جاتی ہے۔ قوس قزح کے رنگ، زرتار قبائیں، چہرے پر وہ نکھار اور شادابی جو دیر تک سو کر اٹھنے کے بعد آ جاتی ہے۔ جسم میں چستی اور توانائی اور اب جو اس نے ایک بھرپور اعتماد کے ساتھ بولنا شروع کیا تو ہر شخص حیرت میں ڈوبا اس کا منھ تک رہا ہے۔ یہ وہی ہے؟ کیا یہ وہی ہے؟ ہاں ہاں یہ وہی ہے۔

یہ انداز اس سڑک نے کہ جس کے جسم و جاں میں زماں و مکاں کی لامحدود وسعتیں تحلیل ہو گئی ہیں، بہت دیکھے ہیں اور جب کبھی فرصت کے لمحوں میں اس کی طبیعت موج پر آتی ہے تو وہ کہتی ہے، یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی عمارتوں کے متعلق میرا تو یہ تجربہ ہے کہ ان میں سے ایک وقت میں بس ایک ہی بولتی ہے، سوچو کہ اگر سب، یا دو چار ہی ایک ساتھ بولنے لگیں تو کیا مچھلی بازار کا سماں بندھ جائے۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ جو بولتے بولتے اچانک رک جاتی ہے، وہی محفل میں افسردہ دکھائی دیتی ہے، اور وہ نئی بولنے والی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سخت سست کہتی رہتی ہے۔ تم بولو گی؟ ہونہہ بولنا بھی آتا ہے؟ پیدائشی گونگی نہ ہوتیں تو اور جانے کیا کرتیں۔

مگر جس طرح ہر جسم کے متعلق یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ایک دنیا تو اس کے باہر آباد ہوتی ہے، اور ایک دنیا اس کے اندر۔ اسی طرح اس عمارت کے جسم کے باہر ایک دنیا آباد ہے

اور ایک دنیا اندر۔ اور بڑی عجیب سی بات ہے کہ نہ باہر کی دنیا یہ جانتی ہے کہ اس کے سینے کے اندر بھی کوئی دنیا آباد ہے (اور اگر کہیں اس نے اڑتی اڑتی خبر اس کی سن بھی رکھی ہو، تو بھی اسے یہ علم نہیں ہوگا کہ وہ دنیا کیسی ہے، کس طرح آباد ہے، اور کون کون لوگ اس میں آباد ہیں) اور نہ اندر کی دنیا یہ جانتی ہے کہ اس کا ایک قالب بھی ہے، جو ایک آبادیوں والے پرشور سے بازار میں کھڑا ہے جہاں ایک عالم سانسیں لے رہا ہے۔ اور جب اسے دیکھیں تو یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ ایک بہتا ہوا دریا ہے، جو ہر آن ایک نیا دریا بن جاتا ہے، ہر آن اس کی موجوں کا قافلہ ایک نئے کوچ کی تیاریاں کرتا دکھائی دیتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ یہ کام کہ اندر کی دنیا باہر کے متعلق جانے اور باہر کی دنیا اندر کے متعلق جانے۔ ان لوگوں کا تھا جو اسی کے اندر رہتے تھے، ساتھ ہی ان لوگوں کا بھی تھا جو اس کے باہر رہتے تھے، یوں کہ متحرک قوت تو وہی تھے کہ دنیائیں تو صبح و شام کے سفر سے بے نیاز کھڑی جیسے گھورتی رہتی ہیں۔ یہ آدمی ہے جو دنیا کو، وقت کو جینے کا مقصد سکھاتا ہے، اسے چراغ دکھاتا ہے کہ راہ کا اونچ نیچ نظر میں رہے، اور دوش بہ دوش چلنے کا رواج قائم ہو۔

چنانچہ جب انہوں نے جو اندر ہیں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں سمجھی کہ باہر سے کوئی رشتہ رکھیں، اور نہ باہر والوں نے ہی اس کی کوشش کی کہ اندر بھی جھانکیں، تو اس سے بظاہر تو کسی کا نقصان نہیں ہوا، لیکن غور کیجئے تو نقصان دونوں کا ہوا۔

لیکن یہ عمارت اگر پر رونق اور پرسکون بازار میں بھی کھوئی کھوئی اچاٹ اچاٹ سی دکھائی دیتی ہے، تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اندر سے بھی اتنی ہی خاموش ہوگی، اسی طرح فکروں میں ڈوبی ہوئی، یا پھر پچھلے پہر کے کسی خواب کی تعبیر پر غور و خوض کر رہی ہوگی۔

ابھی وہ نسل زندہ تھی، جس نے جھکڑوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اس طوفان نے تو اس گھر کو اندر سے بالکل کھوکھلا کر دیا تھا۔ یہ طوفان دوسروں سے اس قدر مختلف تھا کہ لگتا تھا کہ ہزاروں کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے آیا تھا۔

دیکھنے والوں کو آج بھی اس دن ہونا کی یاد تھی کہ یکایک گرد و غبار میں اٹی ہوئی قوی الجثہ شبیہیں اس گھر میں اتریں، اس طرح کہ جیسے آسمانوں میں سیڑھیاں لگا کر نیچے کی طرف آئی ہوں، اور دروازوں اور کھڑکیوں سے اندر گھسی ہوں۔ پہلے وہ محض بکھراؤ تھیں، پھر انہوں نے

ایک شکل اختیار کی، اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بلند قامت جنات کی فوج نظر آنے لگیں۔ بے صورتی کسی طرح مراحل طے کر کے، ایک صورت وضع کر لیتی ہے، اس کا تجربہ انہیں پہلی بار اسی موقع پر ہوا تھا۔

انہیں یاد تھا کہ آنکھیں چنگاریاں بن گئی تھیں، چہرے آگ بھبوکا ہو گئے تھے۔ ہاتھ چلتی تلواروں میں ڈھل گئے تھے اور وہ خود نہ گرد تھے، نہ بکھراؤ تھے اور نہ طوفان تھے، وہ محض عفریت تھے، وہ محض غیظ و غضب تھے۔

تلوار نے کیا کیا لہو کے گلستاں آباد کیے۔ کتنے دریا کے اس پار اتر گئے اور کتنے ماضی کا ایک حصہ بن گئے، کوئی حساب نہیں ان کا۔ شاید وہ طوفان، وہ بے صورت بگولوں کا ایک جم غفیر، اور وہ جنوں کا لشکر اگر آتا اور چلا جاتا، تو لاشیں گنی جا سکتی تھیں، مرنے والوں کی تجہیز و تکفین کی جا سکتی تھی، لیکن وہ تو جس طرح ہر طوفان اپنے پیچھے برق و باراں کا ایک منہ زور سلسلہ چھوڑ جاتا ہے، سو اس طوفان نے بھی چھوڑا۔

وہ لوگ جو اس طوفان برق و باراں کے عینی شاہد ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ کشتی کو یہ بارش کا سرکش دریا کہاں بہا لے گیا، کچھ پتہ نہیں چلا۔ پہاڑی ندیاں کیسی باغی ہوتی ہیں۔

تو یہ بارش بھی شاید اسی نہج پر آئی تھی۔ لاشیں نالوں سے بہہ گئیں، دروازوں سے نکل کر گلیوں، کوچوں اور سڑکوں پر نکل گئیں، یا انہیں آسمان اڑا لے گیا، کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

باب دوم

کہانی والے بابا نے ایک ذرا دم لے کر اپنی گفتگو دوبارہ شروع کی۔

جاتے ہوئے کہتے تھے قیامت کو ملیں گے۔

دیوار کی دو ایک اینٹ ادھر اُدھر ہو جاتی ہے تو دیوار ہل جاتی ہے، یہاں تو اتنی ساری اینٹیں طوفان کی نذر ہو چکی تھیں کہ سوچنا پڑتا تھا کہ یہ عمارت آخر کھڑی ہے تو کیسے کھڑی ہے قدرت کا کوئی انتظام، اس کے اندر چھپی کوئی طاقت، یا اس کی تاریخ کے سنہرے اوراق۔

سوچ اگر اسی ڈگر پر نکل کھڑی ہوتی ہے کہ ہم یوں کڑیل جوان تھے ہم میں یوں کس بل تھا، ہم نے یوں معرکے سر کیے تھے، تو انتہائی ضعف کے باوجود انسان خود کو بہت دور تک کھینچ کر لے جاتا ہے۔

لیکن اندر کی شکستگی دیکھ کر تو بس خدا ہی یاد آتا تھا۔ کہانی والے بابا نے آہ بھر کہا۔ کیا جوانی تھی بیساکھی والے بابا کی۔ کون کون سی شے طوفان کی نذر ہو گئی، کیا بگڑا، کتنا کچھ نقصان ہوا؟ اس جواں سال شخص نے پوری عمارت میں یعنی یہ سمجھئے کہ پورب سے پچھم اور اتر سے دکھن، ہر کونے کاتر کے مکینوں کو یہ خبر کر دی کہ ہم لوگ ذرا ان باتوں کا سیکھا جوکھا لینے کے لئے مل بیٹھیں۔

آس پاس کے لوگ، مرد عورت، لڑکے لڑکیاں، جواں سال، ضعیف، غرض سبھی لوگ جو عمارت میں رہتے تھے، اس بات سے واقف ہو گئے کہ بیساکھی والے بابا نے بڑے آنگن میں سبھوں کو بلایا ہے۔ ان دنوں وہ کڑیل جوان تھا، اور عمارت کے مکین اسے رہبر قوم کے نام سے پکارتے تھے، یوں وہ رہبر کے نام سے مشہور تھا۔ اس زمانے میں وہ خود بھی جوان تھا، اور اس کے عزائم بھی جوان تھے۔

وہ کہتا ایسے طوفان تو کئی بار پہلے بھی آ چکے ہیں، لیکن اگر ایک بار یہ فیصلہ کر لو کہ جو کچھ طوفان اڑا لے گیا ہے، یعنی جو کچھ تم سے چھین لیا گیا ہے، اسے تم دوبارہ حاصل کر لو گے، تو یقین جانو خدا تمہاری مدد کرے گا، اور تم جلد یا بہ دیر دوبارہ ساری چیزیں حاصل کر لو گے۔ ہمت اور عزم راسخ اس راہ میں تمہاری معاونت کرے گا۔

رہبر نے کمروں میں، برآمدوں میں، صحن میں، انگنائی میں، چھت پر، یعنی جہاں بھی عمارت کے مکیں ملے، انہیں یہ خبر بہم پہنچا دی کہ سبھوں کو بڑے آنگن میں آنا ہے۔

لیکن اس کے بعد کہانی والے بابا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ایک تبدیلی جو بڑی عجیب سی نظر آئی، وہ یہ تھی کہ اب سامنے کے جلوؤں کے پس پشت کچھ اور بھی جلوے برسر عمل ہوا کرتے تھے۔ ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ رہبر کی باتوں سے سبھوں کو اتفاق ہے، سبھی اس نہج پر سوچ رہے ہیں کہ ہر فرد اپنی ہمت اور اپنے پختہ ارادے کو آواز دے، اور اسے روبہ کار لائے تو طوفان و برق و باراں سے جو تباہیاں ہوئی ہیں ان کا سد باب ہو سکتا ہے اور پہلے جیسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔

منافقت میرے بچو منافقت۔ سارا فتنہ دل کی اس ایک خرابی سے پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ شخص جو تمہارے سامنے کھڑا ہے، یہ وہ نہیں ہے جو ہے، یا یوں سمجھو کہ یہ جیسا دکھائی دیتا ہے،

ویسا ہے نہیں۔ دل کی اس بیماری سے بس خدا ہی واقف ہوتا ہے۔

تو پس پردہ منافقت جو جال بچھا رہی تھی، اس کا علم تو ہمیں بعد میں ہوا۔

کہانی والے بابا نے رک کر کہا۔ بتانے والے نے مجھے حادثہ گزرنے کے بعد بتایا کہ سرگوشیوں میں کتنے متخالف اور متصادم خیالات پروان چڑھ رہے تھے۔ پہلے بھی ہم یکجا ہوئے تھے، لیکن نتیجہ وہی نکلا، ڈھاک کے تین پات۔ ایک طوفان بلاخیز کا سامنا کرنا پڑا۔ پچھلی بار تو یہ عمارت کچھ مضبوط بھی تھی، لیکن اب تو خاصی کمزور ہو گئی ہے۔ اب یہ کیا کسی بڑے طوفان کا مقابلہ کر سکتی ہے؟

ایک خیال یہ تھا کہ گھر کی فکر کیا، وہ تو بتدریج بنتا ہی رہے گا۔ یہ سوچیں کہ اگر پاس والی عمارت والے، ہماری دیکھا دیکھی اندرونی تعمیر کی بات کرنے لگے، تو ہم کہاں رہیں گے؟ ہمیں تو پتہ نہیں کیوں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ عمارت تو اس عمارت کو ایک ٹکر میں ختم کر دے گی۔

کچھ لوگ کہتے تھے کہ یہ سیاست ہے، محض اپنی لیڈری چمکانے کا ایک ذریعہ۔

ایک طبقہ کہتا تھا کہ یہ سب بکواس ہے، کھاؤ پیو اور مست رہو، ہر چند کہ یہ لوگ بہت ہی چھوٹی تعداد میں تھے، لیکن کبھی کبھی ایک ذرا سی خراش بھی بڑا زخم بن جاتی ہے۔ ایک بڑے ناسور میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

لیکن پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ بیشتر لوگ، جن میں پیر و جواں بھی تھے، رہبر کے سماجی اور سیاسی مطمح نظر سے اتفاق کرتے تھے۔

کہانی والے بابا نے کہا۔ سطح آب پر سکون تھی، لیکن زیریں لہریں کسی قدر مضطرب تھیں۔ اگر تھوڑا بہت بھی اضطراب ہو تو یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہر طرح سے اطمینان ہے، اور یہی اس اجتماع میں دیکھنے میں آیا، جسے رہبر نے بلایا تھا۔

وہ چھٹی کا دن تھا، موسم خوشگوار تھا، سردیوں کی آمد آمد تھی اور دھوپ کی تمازت میں خاصی کمی آ گئی تھی۔ رہبر نے جلسے کے لئے لوگوں کو چار بجے دن کا وقت دیا تھا، لیکن لوگ تین ہی بجے سے آنے لگے تھے۔

چار بجتے بجتے کافی لوگ آ گئے تھے۔ رہبر نے ایک نظر مجمع کی طرح دوڑائی اور اپنے ہم عمروں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "پندرہ منٹ اور ٹھہر جائیں"۔

اس عرصے میں کچھ لوگ اور آ گئے۔ تب ہی رہبر نے جلسے کا رخ دیکھ کر بھانپ لیا کہ اب ہر شخص چاہتا ہے کہ بات شروع کی جائے۔

بڑا آنگن یہاں سے وہاں تک بھرا ہوا تھا۔ رہبر، ڈھال والے صاحب، زنجیروں والے صاحب، الجھے سلجھے خیالوں والے صاحب، کتابوں والے صاحب اور تڑپتے ہوئے لہو والے صاحب کو لے کر چھت پر چلے گئے، جہاں منڈیر کے قریب فرش بچھا تھا۔

ان سبھی لوگوں کو جنہیں رہبر چھت پر لائے تھے، اور جنہیں انہوں نے اپنے آس پاس فرش پر بٹھایا تھا، ان کے خیال میں اس مکان کے ایسے مکین تھے، جو صائب الرائے، سنجیدہ اور باوقار تھے، اور پھر ان ہی لوگوں نے صدارت کے لیے میرا نام پیش کیا۔ کہانی والے بابا نے چند ثانیے کے لئے رک کر کہا۔ میں ساحل پر کھڑا رہنا پسند کرتا ہوں لیکن بسا اوقات ہوتا یہ ہے کہ لوگ مجھے بھی موج بلا میں اتار دیتے ہیں۔ میرے لاکھ انکار کرنے کے باوجود۔

تو اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ میں جلسے میں نظم و نسق قائم رکھوں۔

تب ہی رہبر نے جھنڈا اٹھایا اور تقریر شروع کر دی۔

طوفان آتے ہیں اور جس تندی و تیزی سے آتے ہیں اسی تندی و تیزی سے اتر بھی جاتے ہیں۔

ہمت اور تحمل چاہیے۔ ہم اپنے بام و در، اپنے طاق و روزن، اپنی دیواروں اور فرش کو ایک بار پھر پہلی حالت میں لا سکتے ہیں۔

سب کچھ چھن جانے پر بھی کچھ نہیں گیا ہے، کہ ابھی ہمارا گھر ثابت و سالم ہے۔

اس پر زندہ باد کے بڑے زوردار نعرے بلند ہوئے۔ تالیاں بجائی گئیں، جلسے میں بڑا جوش و خروش تھا کہ اتنے ہی میں چند نوجوان زندہ باد اور پائندہ باد کے نعرے لگاتے، دندناتے ہوئے چھت پر چلے آئے۔ صدر کی نشست چھت کی منڈیر سے بالکل ملی ہوئی تھی۔ رہبر کا بایاں پاؤں چھت پر تھا تو دایاں پاؤں منڈیر پر، اور وہ کسی سہارے کے بغیر کھڑے تھے۔ ان کے بائیں ہاتھ میں جھنڈا تھا اور وہ اپنی باتوں میں زور دینے کے لئے دائیں ہاتھ سے اشارے کرتے جا رہے تھے۔

نعرے لگانے والے نوجوان صدر کے قریب آ گئے تھے۔ انہوں نے کاغذوں میں لپٹے کئی ہار نکالے اور باری باری رہبر کی گردن میں ڈالنے لگے۔ وہ زور زور سے نعرے لگا رہے تھے، اور انہوں نے تین طرف سے رہبر کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا، اس طرح کہ وہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہے تھے، ہاں نیچے آنگن میں بیٹھے لوگ انہیں ضرور دیکھ رہے تھے۔

پھر اللہ جانے کیا ہوا، ہم لوگوں نے تو نہیں دیکھا، لیکن بعد میں نیچے بیٹھے ہوئے لوگوں نے بتایا کہ جو لوگ رہبر کو گھیرے میں لئے تھے، ان میں سے کسی نے ان کے اس پاؤں پر جو منڈیر پر تھا، ایسی زبردست ضرب لگائی کہ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکے اور نیچے آ رہے۔

رہبر گرے تو نیچے بیٹھے لوگوں میں سے ایک صاحب کے سر پر شدید چوٹ آئی، ایک کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ادھر رہبر گرتے ہی بے ہوش ہو گئے، اور ان کے جسم سے خون کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ وہ شام کیسی غضب کی شام تھی، آہ و بکا، چیخ و پکار، قیامت کا شور بپا تھا۔

کسی کے شان و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ گھر کی ایسی ہر دلعزیز شخصیت اچانک اوپر سے نیچے آ رہے گی۔ سب ہی سناٹے میں آ گئے یہ کیا ہوا؟ سازش اور کھلی کھلی سازش۔ ڈر سے سہمے ہوئے لوگ سرگوشیوں میں ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے۔

ایک لمحے کے لئے یہ محسوس ہوا کہ چشم زدن میں سب کچھ ختم ہو گیا۔ سوچنا، سمجھنا اور آگے کے متعلق غور و خوض کرنا۔ یہ محسوس ہوا کہ گھڑی کی سوئی پر ایسی زبردست چوٹ پڑی کہ وہ یکلخت بند ہو گئی۔ زندگی، تحرک، تلاطم، رہبر کیا گرے کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔

لیکن کچھ ایسے مضبوط اعصاب کے لوگ بھی وہاں موجود تھے جو بڑی سے بڑی مصیبت کے وقت بھی، پورے ہوش و حواس میں رہتے ہیں، اور حالات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے رہبر کے منھ پر پانی کے چھینٹے ڈالے، ان کے زخم کو دھویا، اور پھر خون روکنے کے لئے جسم کے مختلف حصے پر اور پھر سر پر جلا ہوا کپڑا ڈالا۔ اس درمیان انہوں نے ایک شخص کو اس ڈاکٹر کو لانے بھیج دیا جو اس گھر کا خاص ڈاکٹر تھا، اور بیماری آزاری میں بلایا جاتا تھا۔ وہ اس عمارت کا رازداں تھا اور لوگ اس پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ جس شخص کو انہوں نے ڈاکٹر کو بلانے بھیجا تھا، اس کے متعلق بھی وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ اس حادثے کے متعلق

عمارت کے باہر کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔

کچھ لوگ ان افراد کی مرہم پٹی کر رہے تھے جو رہبر کے گرنے سے زخمی ہو گئے تھے۔ ایک بچہ چل کر ختم ہو گیا تھا، لوگ اسے دفن کرنے کے لئے لے جا رہے تھے، اور اس کے ماں باپ کو دم دلاسا دے رہے تھے۔

رہبر بے طرح کراہ رہے تھے، تکلیف کے سبب ان سے بولا نہیں جا رہا تھا، تب ہی انہوں نے اشاروں میں بتایا کہ وہ اپنے کمرے میں جانا چاہتے ہیں۔ اس پر لوگوں نے چاہا کہ انہیں اٹھا کر کمرہ میں پہنچا دیں، لیکن انہوں نے بڑی مشکل سے اٹک اٹک کر کہا کہ "مجھے سہارا دو"۔ انہیں دو اشخاص نے اٹھا کر کھڑا کیا تو پتہ چلا کہ پشت پر ان کی قمیص خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔ لیکن رہبر کی ہمت اب بھی جوان تھی، اور یوں وہ کسی طرح دو تین افراد کے سہارے چل کر اپنی چارپائی پر پہنچ گئے۔ ان کے دونوں پاؤں بری طرح زخمی تھے، اور جلد کے پھٹ جانے سے دائیں پاؤں کی ہڈی نظر آنے لگی تھی۔ غرض کہ رہبر کی حالت تشویشناک تھی۔

ڈاکٹر کے آتے آتے ان کے کپڑے بدل دئے گئے۔ ان کی سانس پھول رہی تھی اور وہ بڑی مشکلوں سے چھوٹے چھوٹے جملے ادا کر سکے۔ پورا جسم پھوڑا بنا ہوا تھا لیکن ایسے نازک موقع پر بھی انہیں یہ خدشہ بار بار لاحق ہوتا کہ کہیں جذبات میں آ کر لوگ کوئی غلط کام نہ کر بیٹھیں۔ اس لئے وہ کبھی آنکھ کے اشارے سے اور کبھی گردن کی جنبش سے، اور کبھی ہلکے سے ہاتھ ہلا کر کسی کو بالکل اپنے منھ کے قریب بلاتے، اور جب دو تین افراد ایک ساتھ ان کے قریب آ جاتے تو وہ بہ مشکل تمام ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہتے۔ پولس میں کوئی رپورٹ نہ کی جائے۔ نہ ہی میں پولس کے سامنے کسی کا نام لوں گا۔ یہ سب خانگی زندگی میں ہوتا ہی رہتا ہے، یہ ہمارا گھریلو معاملہ ہے۔ ان کی آواز میں بے حد نقاہت تھی، اور انہیں پوری طرح سمجھنا بہت مشکل تھا۔ وہ بہت ہلکی آواز میں اٹک اٹک کر ایک ایک جملہ ادا کر رہے تھے۔ جب وقت آئے گا تو ایک بڑے کاز کے لئے سب لوگ ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوں گے۔

ڈاکٹر آیا تو اس نے سارے زخم کو اچھی طرح صاف کیا، اور کئی جگہ ٹانکے لگائے۔ اس کے علاوہ کئی جگہ کے ایکسرے اور کئی طرح کی جانچ پڑتال کے لئے کہا، اور جاتے جاتے یہ مشورہ دے گیا کہ اگر رہبر کچھ دن کے لئے کسی ہسپتال میں رہ لیں تو علاج معالجے میں بڑی

سہولتیں ہوں گی۔

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ گھر پر ہسپتال جیسی بات کہاں پیدا ہوتی۔ وہاں رہبر کے دونوں ہاتھ پاؤں پر پلاسٹر چڑھا دیا گیا، اور سر اور سینے پر اچھی طرح بینڈیج کر دیا گیا۔

رہبر ہسپتال آنے جانے والوں سے مکان کی خبر لیتے رہتے۔ کچھ خاص لوگوں سے انہوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ وہ بات راز ہی رہی یا عام ہو گئی۔

ظاہر ہے کہ پولس کو یہ خبر نہیں دی گئی، اور عمارت کے مکینوں کو یا یوں کہئے کہ بیشتر مکینوں کو مکان کی فلاح و بہبود عزیز تھی، اس لئے عام خیال تھا کہ یہ بات یہیں کی یہیں رہی، باہر نہیں گئی۔

باب سوم

کوئی تین مہینے تک رہبر کو ہسپتال والوں نے گھر جانے نہیں دیا۔ پلاسٹر کاٹ دیئے گئے، اور وہ دو آدمیوں کے سہارے کچھ چلنے پھرنے بھی لگے، ہر چند کہ ان کے دونوں پاؤں کے گھٹنے بیکار ہو گئے تھے اور کئی چھوٹی موٹی ہڈیاں بھی ٹوٹی پڑی تھیں۔ ڈاکٹر ایک بڑے آپریشن کا مشورہ دیتے تھے، جن سے ساری ٹوٹی پھوٹی ہڈیاں قرینے سے یکجا کر دی جاتیں، لیکن رہبر سے جب بھی کسی بڑے آپریشن کی بات کی جاتی وہ بگڑ جاتے۔

چنانچہ ہوا یہ کہ جب وہ دو تین ماہ کے بعد ہسپتال سے نکلے تو ان کے دونوں پہلوؤں میں بیساکھی دبی تھیں۔

شروع میں بیساکھیوں کی آواز سماعت پر بے حد گراں گزرتی تھی۔ کھٹ کھٹ۔ کھٹ کھٹ۔ کھٹ کھٹ لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے، اس آواز میں نغمگی آتی گئی۔ ٹھک ٹھک۔ ٹھک ٹھک۔ ٹھک ٹھک۔

اب بیساکھی کے سہارے چلنے والے رہبر کو، گھر والے، بیساکھی والے صاحب کہنے لگے تھے۔ رہبر جانے کس مٹی کے بنے ہوئے تھے کہ انہیں دیکھ کر اگر ان کا کوئی دوست آبدیدہ ہو جاتا تو وہ اسے سمجھاتے۔ ''کیا ہوا مجھے؟ کیا کمی پاتے ہو مجھ میں؟ میں ان بیساکھیوں کے سہارے اب بھی دو تین میل پیدل چل سکتا ہوں''۔

دراصل گھر کے لوگوں نے ان کی سیماب وش جوانی دیکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ بہادر

اور نڈر شخص ہیں، اور طوفان گزرنے کے بعد، اس گھر کو ایسے ہی لوگوں کی ضرورت تھی، جو حالات کا مردانہ وار مقابلہ کر سکیں۔ یوں جب وہ انہیں اس طرح بیساکھیوں کے سہارے چلتے دیکھتے تو وہ یہ سوچ کر کانپ اٹھتے کہ اب گھر کا کیا ہوگا؟

لیکن حقیقت اس سے برعکس تھی کہ رہبر کے ذہن میں گھر والوں کے لئے، اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے اب بھی بہت سے منصوبے تھے۔ اس حادثے کے بعد بھی اس کے حوصلے بلند تھے۔

وہ آج بھی یہی چاہتے تھے کہ گھر کے لوگ طوفان کے حادثے کو فراموش کر کے تعمیری کاموں میں لگ جائیں، اور اچھے دنوں کو واپس لانے کی سعی کریں مکان کے اندرون میں کئی کئی چکر لگاتے۔ ان کی بیساکھی کی کھٹ کھٹ سے، گھر والے سمجھ جاتے کہ 'بیساکھی والے صاحب' اپنے کمرے سے نکل چکے ہیں۔

رہبر سوچتے کہ ایک جلسہ پھر بلایا جائے، لوگوں سے بات کرنے کے لئے ان کی تجاویز سننے کے لئے اور ان کے سامنے کچھ ٹھوس تجاویز پیش کرنے کے لئے۔ وہ سوچتے کہ گھر کے اندر اگر ایک مرکزی میٹی کی تشکیل عمل میں آجائے، اور اس کی دعوت پر سب لوگ آئیں اور سر جوڑ کر بیٹھیں تو یقینی وہ گھر کی بہبودگی کے لئے کوئی منصوبہ تیار کر سکتے ہیں، در و دیوار کی بوسیدگی دور کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

مگر وہ کس طرح لوگوں کو یکجا کریں، کس طرح اپنی بات ان تک پہنچائیں، اور کس طرح انہیں اپنا ہمنوا بنائیں۔ اصل مسئلہ تو یہ تھا۔

یہاں منتشر الخیالی کا یہ عالم تھا کہ کچھ لوگ تو کھلے بندوں یہ کہتے تھے کہ ابھی تعمیر کا وقت نہیں آیا ہے، جب وقت آئے گا تو سب کچھ آپ ہی آپ ہو جائے گا، کچھ لوگ اسے فعل عبث قرار دیتے اور کچھ لوگ یہ کہتے کہ یہ کام ناممکن العمل ہے۔

لیکن رہبر کو اصل شکوہ تو ان لوگوں سے تھا، جو ان سے بہت قریب تھے۔

'کہانی والے بابا' ہیں کہ سب کہانی سنائے جاتے ہیں، وہ واقعات کی ترمیم و تنسیخ میں ہماری کوئی مدد نہیں کرتے۔

"حال والے صاحب ہیں جو نہ ماضی کو جانتے ہیں نہ مستقبل کو۔ وہ بس حال کو جانتے

ہیں، اور وہ بھی معلق سے حال کو۔ اگر کسی زمانے کو اس کے دونوں کناروں سے منقطع کر دیا جائے، تو اس کی کچھ ایسی ہی حالت ہوتی ہے۔

"زنجیروں والے صاحب" کبھی سرکس میں کام کیا کرتے تھے۔ رہبر کبھی موڈ میں ہوتے تو وہ بڑی خوش دلی سے اپنے احباب کا ذکر کیا کرتے۔

وہ زنجیروں والے صاحب کے جوانی کے دن تھے، نام ان کا وقار تھا، گورا چٹا رنگ اور لمبے چھریرے جسم کے مالک تھے۔ سرکس کا آخری آئیٹم وہی پیش کرتے تھے۔ یعنی سات ہارس پاور کی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر، ایک پنجڑے نما گلوب میں، اسے نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے دوڑاتے تھے۔ وہیں سرکس میں ایک مس لیلیٰ بھی تھی، جو جھولے پر قلابازیاں کھاتی ہوئی، ایک جانب سے دوسری جانب جاتی تھی۔ سرکس والیوں کا جسم خوب کسا کسایا ہوتا ہے، سو مس لیلیٰ کا جسم بھی خوب تنا ہوا تھا، نکھرتا ہوا رنگ، لمبا قد۔ وقار دل دے بیٹھے۔ وہ بھی انہیں پیار کرنے لگی تھی، لیکن ہوا یہ کہ جب ایک بار وقار نے اس کے سامنے شادی کی تجویز پیش کی، تو اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ "پہلے اپنا ریلیجن بدلو، تب ہی ہم شادی کی بات سوچیں گے"۔

وقار کو اس کے صاف انکار کرنے سے دلی صدمہ پہنچا۔ اس دن سرکس کا آخری آئیٹم پیش کرتے ہوئے انہیں پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ موٹر سائیکل بار بار ان کی گرفت سے نکلی جا رہی ہے، اور وہ اسے بڑی مشکلوں سے اپنے قابو میں کر رہے ہیں۔ اللہ اللہ کر کے یہ آئیٹم ختم ہوا تو وہ سیدھے منیجر کے پاس گئے اور اس کے لاکھ منع کرنے پر بھی اسے اپنا استعفیٰ دے کر گھر چلے آئے۔ ہفتے عشرے میں انہوں نے سرکس والوں سے اپنی تمام جمع کی ہوئی پونجی اور رقمیں وصول کرلیں، اور پھر سدا سدا کے لئے اپنے کمرے کے ہو گئے۔

نئے لوگوں نے انہیں بہت کم دیکھا تھا، لیکن رہبر بتاتے تھے کہ ان کے کمرے کی دیوار پر مس لیلیٰ کی تصویر لٹکی رہتی تھی، اور زنجیروں والے صاحب، جو کبھی دس پیکٹ سگریٹ روز پیا کرتے تھے زنجیر در زنجیر دھوئیں کے چھلے بنا بنا کر مس لیلیٰ کی گردن میں ان کے ہار پھینکتے جاتے تھے۔ پھر سگریٹ مہنگی ہو گئی تو انہوں نے پانچ پیکٹ کر دیا۔ سگریٹ اور مہنگی ہوئی تو انہوں نے دو پیکٹ روز پینا شروع کیا اور جب سگریٹ کی قیمت میں مزید اضافہ ہو گیا، تو وہ ایک پیکٹ سگریٹ روز پر اتر آئے، اور اس دن انہوں نے یہ تہیہ کر لیا کہ اب سگریٹ کی قیمت جتنی بھی

بڑھے، وہ ایک پیٹ سگریٹ کا کوٹہ قائم رکھیں گے۔

رہبر رازدارانہ لہجے میں کہا کرتے۔ ''ارے بھئی زنجیروں والے صاحب، سگریٹ تھوڑے ہی پیتے ہیں، وہ تو دراصل مس لیلیٰ کو دھوئیں کے ہار پہنایا کرتے ہیں ہر روز سیکڑوں کی تعداد میں''۔

'حال والے صاحب' جو کبھی جمال کہلاتے تھے، اپنی خوش پوش اور خوش وضعی کے لئے مشہور تھے، یوں وہ صرف حال کے آدمی تھے، نہ کبھی ماضی کی بات کرتے اور نہ کبھی مستقبل کی۔ بس آج کی بات، اور آج کے متعلق ایک رائے رکھنا ان کا شیوہ تھا۔ 'کہانی والے بابا' ان کے بارے میں کہتے تھے کہ ان کا وقت طلوعِ آفتاب سے غروب آفتاب تک رہتا تھا۔ غروب آفتاب سے طلوعِ آفتاب تک وہ ایک ایسے فرد ہو جاتے، جو صرف کھا پی سکتا تھا۔ بول چال سکتا تھا اور بس۔ کسی قسم کی رائے، کسی قسم کی فکر اور کسی قسم کا خیال اس سے کوسوں دور ہوتا۔ طلوع آفتاب کے بعد آج کی فکر، آج کے سلسلے کی رائے اور آج کے متعلق خیالوں کا ریلا سا ان کے ذہن میں آجاتا۔ ویسے ان کے متعلق یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ان کی فکر طلوع آفتاب کے بعد ہی ہوتی ہے، جو اخبار کے اس پہلے صفحے کی ہوتی ہے، جو ان کی نظر سے گزر چکا ہوتا ہے۔ بڑی ہی عجیب الخلقت شخصیت تھی ان کی۔ ان کے متعلق یہ بات بھی مشہور تھی کہ وہ آدمی نہایت ہی اکڑ اور نہایت ہی ناقابل اعتبار ہیں، اور یہ کہ وہ محبت اور دلداری کے سارے آداب سے بے بہرہ ہیں۔

الجھے سلجھے خیالوں والے صاحب کا پہلا نام تو عابد تھا، لیکن عرصے تک 'مفکر' کہلائے جانے کے بعد اب الجھے سلجھے خیالوں والے صاحب کہلاتے تھے۔ ان کے پاس کچھ فکر تھی، کچھ سوچنے سمجھنے کو بھی تھا۔ آرٹ، کلچر اور تاریخ سے انہیں خاصا شغف تھا۔ کل، آج اور کل، یہ تینوں زمانے ان کی گرفت میں تھے، لیکن گھر والوں کے سامنے ان کی حد درجہ منطقی گفتگو جسے وہ حد درجہ الجھی ہوئی گفتگو سمجھا کرتے، سخت پریشان کن ہوا کرتی۔ یعنی یہ کہ ایسا ہوتا تو ایسا ہوتا اور ایسا ہوتا تو ایسا ہوتا۔ ماضی، حال، مستقبل، تینوں زمانے کے لئے وہ ایک ہی منطقی رویہ اختیار کرتے۔ لوگ ان سے کہتے۔ ''الجھے سلجھے خیالوں والے صاحب'' آپ تو الجھی سلجھی فکر کے کاکل میں گرفتار رہتے ہیں، لیکن حالات کس کل بیٹھیں گے اس کی بھی کوئی خبر ہے آپ کو۔ لیکن

ان کے پاس ہر سوال کا ایک ہی جواب ہوتا۔ ایسا ہوا تو ایسا ہوا اور ایسا ہوگا تو ایسا ہوگا۔

'کتاب والے صاحب' کا نام ابوالخیر تھا۔ لیکن جب انہوں نے خود کو کتابوں میں گم کر لیا تو گھر کے لوگوں نے انہیں "کتابوں والے صاحب" کہنا شروع کیا۔ ماضی کا ادب عالیہ، آج کا ادب، الٰہیات، تاریخ اور سوانح عمریاں، یہی ان کے مخصوص موضوعات تھے۔ وہ اکثر دوستوں اور عزیزوں میں بھی آکر بیٹھ جاتے، کہتے کہ اس طرح دھیان بٹ جاتا ہے اور ذہن کو سکون ملتا ہے۔

ان کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ جوانی میں وہ ہر قسم کا لٹریچر پڑھا کرتے تھے، یعنی یہ شکاریات پر کتاب مل گئی تو اسے بھی پڑھ گئے، جنگی کارناموں پر کتاب مل گئی تو اسے بھی دیکھ ڈالا۔ حتیٰ کہ مناظرے کی کتاب کو بھی چاٹ جاتے، لیکن جانے کیا ہوا کہ ایک دن ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ، بھائی وقت کم رہ گیا ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ مطالعے کو سمیٹو۔ تب ہی انہوں نے اپنے کتب خانے میں صرف ماضی کا ادب عالیہ، آج کا ادب، تاریخ الٰہیات اور سوانح عمریاں رہنے دیں، باقی کتابیں کسی پبلک کتب خانے کی نذر کر دیں۔

کہا جاتا تھا کہ ہر چند کہ انہیں مطالعے سے فرصت نہیں ملتی، لیکن آدمی صائب الرائے ہیں۔

'کہانی والے بابا' اور رہبر، ان کے متعلق کہا کرتے کہ اہل علم کا وجود سماج میں خیر و برکت کا باعث ہوتا ہے۔ غالب کا یہ مقطع اکثر گنگنایا کرتے۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

'تڑپتے ہوئے لہو والے صاحب' بڑے مضطرب اور بڑے بے چین سے آدمی تھے، ہمہ وقت تیغ برہنہ بنے رہتے، ہر چند کہ ان کا نام شاکر تھا۔

انہیں ہمیشہ نرم روی اختیار کرنے کو کہا جاتا، لیکن جب کبھی ان کے اندر لہو کا سمندر امنڈنے لگتا تو پھر وہ ساری نصیحتوں کو یکلخت بھول جاتے۔ گھر کے بیشتر لوگ ان سے یوں خائف رہتے کہ وہ نہایت ہی ڈائریکٹ ایکشن قسم کے آدمی تھے۔ ادھر کچھ ہوا اور ادھر انہوں نے دھڑ سے وار کر دیا۔ کہانی والے بابا اور بیساکھی والے صاحب ان سے کہتے۔

''دیکھو جوانی میں تو یہ باتیں چل جاتی تھیں، لیکن اب جبکہ کہنہ سال لوگوں کی فہرست میں آ گئے ہو، تمہیں عقل و فراست سے کام لینا چاہئے''۔

گھر کے نئے لوگوں کا یہ حال تھا کہ ان میں سے ہر فرد خود کو ایک ادارہ تصور کرتا۔ وہ خود کو بیک وقت سیاست داں، دانشور، ماہر تعلیمات اور مدبر سمجھتا، اور برملا یہ کہتا کہ جو وہ کہتا ہے وہی صحیح ہے، باقی سب کچھ غلط۔ یہی بات تھی کہ جب ایک سے بات کر لو تو لگتا تھا سب سے بات کر لیا۔

''گھر میں عرصے سے قلعی نہیں ہوئی ہے''۔

''ہوگی کیسے؟ میں نے پلاسٹک پینٹنگ کا تخمینہ کروایا تھا، لیکن کہا گیا کہ یہ بہت مہنگا سودا ہے''۔

''اس پر میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ تو پھر ٹھیک ہے، اب آپ لوگ جو چاہیں کریں، اور مجھے خدا کے لئے بخش دیں کہ اب میں اس کے لئے کچھ نہیں کروں گا''۔

اور کم و بیش سبھوں نے یہی رویہ اختیار کیا۔ کوئی آئل پینٹنگ کی بات کرتا تھا، تو کوئی چونے کی پوتائی کرنے کو کہتا تھا۔ چنانچہ ہوا یہ کہ بات جہاں تھی وہیں رہی۔

بیساکھی والے صاحب کڑھ کڑھ کر رہ جاتے۔ اس پر کہانی والے بابا کہتے۔

''شاید ابھی وقت نہیں آیا ہے، چوٹ پڑنے کے بعد ہی ہوش آتا ہے''۔

'زنجیروں والے صاحب' کو آواز دی گئی۔ بیساکھی والے صاحب کے بلانے پر وہ آتو گئے لیکن چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ ظاہر ہے آدمی جب گوشہ نشیں ہو جاتا ہے تو اسکے سارے جسم پر پھپھوندی لگ جاتی ہے، سو یہی حال زنجیروں والے صاحب کا بھی ہو گیا تھا۔

جب انہیں صورتحال سے آگاہ کیا گیا، تو انہوں نے گلا صاف کر کے کہا۔

''سنو رہبر، دنیا ایک بہت خوبصورت فریم میں رکھی ہوئی تصویر ہے، میں اسے دھوئیں کے بار پہنا رہا ہوں۔ میرے اس کارنامے کو تم معمولی سمجھتے ہو''۔

بیساکھی والے صاحب زیر لب بڑبڑائے۔ ''لعنت ہے تم پر''۔

حال والے صاحب نے کہا ''دیکھو صبح ہوگئی، اور وقت تیزی سے گزرتا ہوا شام تک پہنچ جائے گا، پھر سوچو کہ اس مختصر سے وقت میں میں کہاں رہوں گا''۔

الجھے سلجھے خیالوں والے صاحب نے کہا کہ اگر اس وقت قلعی کروادی جاتی کہ جب طوفان آیا تھا، تو ساری قلعی ڈھل جاتی اور پیسے برباد جاتے، اور آج بھی سال کے دو چار مہینے بارش کے ہوتے ہیں، اگر قلعی کرائی گئی تو دو چار مہینے بعد برسات شروع ہو جائے گی اور سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

کتابوں والے صاحب نے کہا۔ ''کتابوں میں آتا ہے کہ اس دنیا میں بار بار قلعی کرائی گئی۔ لیکن سب ایک مختصر سی مدت کے لئے قائم رہی، اور پھر سب کچھ برق و باراں کی نذر ہو گیا''۔ یہ کہہ کر وہ پھر کتابوں میں گم ہو گئے۔

جب تڑپتے ہوئے لہو والے صاحب کو بلایا گیا تو انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''قلعی کے لئے سبھوں کو معاونت کرنی ہوگی۔ پیسے تو میں تلوار کے زور پر سبھوں سے وصول کروں گا''۔ اس پر رہبر نے کہا۔ بس بس یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں۔ پھر خود کلامی کے انداز میں بولے۔

''ایک معمولی سے کام میں بھی ہر فرد ایک الگ رائے رکھتا ہے۔ یا اللہ کیا ہوگا اس گھر کا''۔

تب ہی انہیں اس نوجوان کی یاد آئی۔ ثبات نام تھا شاید اس کا، رہبر کا خیال تھا کہ وہ عام نوجوانوں سے ذرا مختلف ہے۔

ثبات نے آتے ہی انہیں مؤدبانہ سلام کیا، اور جب رہبر نے گھر کی قلعی کا مسئلہ اس کے سامنے رکھا تو اس نے کسی قدر توقف کے بعد کہا۔ ''بزرگ، یہ قلعی تو اہل خانہ کی دی ہوئی رقم میں سے کرائی جائے۔ رقم زیادہ سے زیادہ نہیں لی جائے گی، کم سے کم لی جائے گی، اور اس رقم میں معمولی قسم کی قلعی ہو جائے گی۔

رہبر اس کا جواب سن کر خوش ہوئے اور انہوں نے سوچا، اس نوجوان کے متعلق میری رائے صحیح تھی۔ خاصا عملی آدمی ہے اور حقیقت پسند بھی ہے۔

اس طرح رہبر اور ثبات کی کوششوں سے گھر میں چونے کی قلعی ہو گئی۔

باب چہارم

لیکن جب برسات آئی تو در و دیوار پر تمام چونے کے آنسو بکھر گئے۔ لوگوں نے منہ

بنایا، اور ثبات کی تجویز کا مذاق اڑایا، لیکن رہبر نے ثبات کے دفاع میں کہا۔
''کیا آئیل پینٹنگ یا پلاسٹک پینٹنگ کے اخراجات تم لوگ برداشت کر سکتے تھے؟''
ایک لمحے کے توقف کے بعد انہوں نے پھر اپنی گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔
''چھتیں ٹپکتی ہیں، فرش ٹوٹ رہے ہیں، دیواریں سیلن کے سبب سخت بوسیدہ اور کمزور ہوگئی ہیں۔ ان کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے''۔
''مکان کی قدامت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اس کی اچھی طرح مرمت کرائی جائے''۔
بیساکھی والے صاحب نے اپنی بیساکھی سے اشارہ کر کے کہا۔ ''دیکھو اس جگہ چلنے میں چھت ہلتی ہے۔ اب یا تو شہتیر ٹوٹ رہی ہوگی، یا چھت اندر سے کھوکھلی ہو رہی ہوگی۔
''وجہ جو بھی ہو لیکن ان خدشات کی طرف بھی نظر دوڑاؤ، لگے ثبات کا مذاق اڑانے''۔
لوگوں نے بیساکھی والے صاحب کا جواب تو نہیں دیا، لیکن یہ پھنکار انہیں بری ضرور لگی، پر یہ کہ اس دن کے بعد گھر کا کوئی قصہ نہیں ہوا۔
چھتیں کئی سال سے ٹپک رہی تھیں، چنانچہ برسات سے کچھ پہلے گھر کے مکینوں کے درمیان چہ میگوئیاں شروع ہو جائیں کہ امسال برسات میں کیا ہوگا؟ بالآخر ان سبھوں نے رہبر سے رجوع کیا۔ رہبر نے گھر کے کچھ اور لوگوں کو بلا کر مشورہ کیا، اور پھر یہ طے پایا کہ ایک چھوٹی کمیٹی بنائی جائے، جو انجینئر، اوورسیئر یا کسی مشاق راج سے اخراجات کا تخمینہ کروائے اور اسے گھر والوں کے سامنے پیش کرے۔
کم و بیش ہر کمرہ ٹپکتا تھا۔ لیکن یہ کہ مشورے کی فیس انجینئر کو دینی پڑے گی تو پھر یہ رقم کہاں سے آئے گی؟ اوورسیئر بھی مہنگا پڑے گا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ کسی راج سے مشورہ کیا جائے اور جب راج نے بھی لمبا چوڑا تخمینہ پیش کیا تو پھر لوگوں کے اندر 'اپنا اور صرف اپنا' کا جذبہ بیدار ہو گیا اور تب ہی کم خرچ بالا نشیں قسم کے راج کو بلا کر انہوں نے اپنے اپنے کمروں کی چھتیں کسی حد تک درست کرالیں۔ فیصد یہی ہوتا کہ راج ٹپکنے والے مقام پر سیمنٹ بھر دیتا، اور لوگ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتے کہ چلو امسال کی برسات تو جوں توں گزر ہی جائے گی۔ اس سے بھی سستا نسخہ یہ ہوتا کہ جوڑنے والا مسالہ خود ہی ٹپکنے والی جگہ پر لگا دیتے۔
اس خود غرضی سے بیساکھی والے صاحب دل برداشتہ ہو کر کہتے

"آخر سکھوں کے متعلق لوگ کیوں نہیں سوچتے؟"

کہانی والے بابا یہ کہہ کر ان کی دلجمعی کراتے۔ "شاید سکھوں کے متعلق سوچنے کا ابھی وقت نہیں آیا ہے"۔

"وقت کب آئے گا؟"

وہ ہاتھ کے اشارے سے بتاتے کہ ابھی اس کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ محض کہانی والے بابا کی رجائیت ہے۔

باب پنجم

تب ایک دن گھر کے ایک نوجوان نے بتایا کہ پورب جانب کی ایک بیس فٹ لمبی دیوار تو ایک عرصے سے سڑک کی جانب جھکی ہوئی تھی، لیکن ادھر اس نے ایک دن یہ دیکھا کہ وہ تقریباً ایک ڈیڑھ انچ اور جھک گئی ہے، اور اب وہ اپنی ملحقہ دیوار سے اتنی دور ہو گئی ہے کہ اس کی درار سے مزے میں سڑک کا منظر دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ خبر ایسی صبا رفتار ثابت ہوئی کہ شام تک رہبر کے کمرے کے سامنے، سارا گھر امنڈ آیا۔

اس وقت رہبر یا بیساکھی والے صاحب ایک دم سے 'محترم' ہو گئے۔

"اب کیا ہوگا محترم؟"

"اگر ہم وقتاً فوقتاً رفو کرتے رہتے، تو شاید آج اس چاک دامانی کا المیہ سامنے نہ آتا"۔

"اب کسی واقف کار سے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ نئی دیوار کھڑی کرنے میں کتنا خرچ آئے گا؟"۔ پھر چند ثانیوں کے بعد بیساکھی والے صاحب نے ایک تجویز پیش کی۔

"میرے خیال میں فی الوقت ایک بڑی چادر دیوار کے پیچھے تان دی جائے تاکہ اگر خدانخواستہ یہ دیوار گر جائے تو پھر گھر کی بے پردگی نہ ہو"۔

اس پر ثبات نے کھڑے ہو کر بیساکھی والے صاحب سے کہا

"محترم بزرگ" ہمارے درمیان اس وقت سلیم بیٹھے ہیں جو اسکرین پینٹنگ، وال پینٹنگ اور پیپر پینٹنگ کے بڑے ماہر ہیں۔ ہم کیوں نہ دیوار کے سائز کے کینوس پر ان سے

جنگل کی سین بنوالیں، یوں کہ ڈیپ شیڈ میں پردے کے پیچھے کا کوئی منظر سڑک والوں کو نظر نہیں آئے گا"۔

سلیم نے کہا "میں یہ کام ہفتے دس دن میں کر دوں گا، لیکن جنگل کی تصویر ہوگی تو اس میں جانور بھی ہوں گے، آپ لوگ یہ بتائیں کہ اس میں کون کون سے جانور رکھے جائیں؟"۔

ثبات نے کہا۔ "جانور میں یہی ہاتھی، بارہ سنگھے، ہرن اور خرگوش وغیرہ ہوں، چڑیوں میں مور اور سارس وغیرہ"۔

ایکدم سے جسیم نے کھڑے ہو کر کہا۔ "یہ جنگل کا منظر ہے یا کسی چڑیا گھر کا"۔

"جنگل میں جب تک جنگل کا بادشاہ شیر نہ ہو، وہ جنگل جنگل کیا ہے، پھر اس کے ساتھ چیتے ہوں، تیندوے ہوں، بھیڑیے ہوں، جنگلی سور ہوں اور اژدہے ہوں، تب ہی کچھ بات بنتی ہے"۔

اس پر رہبر نے کہا۔ "گھر کو بے پردگی سے بچانا ہے، پردہ جیسا بھی ہو"۔

کچھ نوجوان کھڑے ہو کر بولے "ہم لوگ ثبات کی تجویز سے اتفاق کرتے ہیں"۔

وہیں کچھ لوگ جسیم کے حق میں بھی بولنے لگے۔ عجیب افراتفری کا عالم ہو گیا۔

تب ہی رہبر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "آپ لوگ خاموش ہو جائیں"۔

جلسے میں کچھ سکون ہوا تو رہبر نے کہا۔ "میرے خیال میں اکثریت ہرن اور خرگوش والے جنگل کے ساتھ ہے"۔

بڑے زور کی تالیاں بجیں۔

تب طے یہ ہوا کہ ہفتے دس دن میں جب سلیم پردے پر بنائے ہوئے جنگل کے سین کو دیوار کے پیچھے ٹانگ دے گا، تو دیوار توڑ دی جائے اور ایک نئی دیوار کی تعمیر کے لئے رقم فراہم کی جائے گی۔

کوئی پندرہ دن بعد جب پردہ لگ گیا اور دیوار ڈھا دی گئی، تو سڑک کے لوگوں نے ایک بڑے خوبصورت سے جنگل کے مناظر کو اپنی آنکھوں میں بسالیا۔ بارہ سنگھے، ہرن، ہاتھی، خرگوش، پھر پنچھی پکھیرو، مور، سارس اور مرغابیاں۔

ایک خوبصورت لینڈ اسکیپ پر جنگل آباد تھا۔

اس موقع پر رہبر نے کہا۔ "دیکھو کینوس پر بنی ہوئی پینٹنگ گھر کا پردہ تو بن گئی، لیکن

اب تم لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ نہ جاؤ۔ دیوار کے لئے پیسے کا انتظام شروع کر دو۔
لوگوں نے رہبر کی ہدایت پر سنجیدگی سے عمل شروع کر دیا۔

....

لیکن ایک دن جب گئی رات گھر کے اس علاقے کی طرف سے شور اٹھا۔ جہاں جنگل کی سین ٹانگی گئی تھی، تو لوگ دھڑا دھڑ اپنے کمروں سے نکلنے لگے۔ کینوس اور کینوس کی تصویر، سارا جنگل بری طرح آگ کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ پردے پر ربر ناٹ، تیل، وارنش اور رنگ کی ملی جلی بو سارے میں پھیلی ہوئی تھی، اور دھوئیں کے مرغولے تیزی سے اوپر کی طرف جا رہے تھے۔

بیساکھی والے صاحب، زنجیروں والے صاحب، کتابوں والے صاحب، تڑپتے لہو والے صاحب، الجھے سلجھے خیالوں والے صاحب، سب اپنے اپنے حجروں سے باہر آ نکلے تھے اور اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اس جلتے ہوئے جنگل کو دیکھ رہے تھے۔ اس آگ میں انہیں جنگل کے علاوہ اور بھی بہت کچھ جلتا نظر آ رہا تھا۔

رہبر نے کہا "اپنوں نے اپنوں کو نیچا دکھایا"۔

زنجیروں والے صاحب نے کہا "میں تو دھوئیں کا ہالہ بناتا ہوں، مگر یہ تو آگ کا ہالہ ہے۔ آگ نے کب کسی کو بخشا ہے"۔

سب بدحواس تھے۔

رہبر نے دھیمے لہجوں میں کہا۔ "ہم نے تو ان دیواروں کے پیچھے اپنی عزت بچا رکھی تھی۔ اب تو خستگی، ندامت اور بوسیدگی سب کچھ سامنے آ گئی"۔

کس نے کہا۔ "فائر بریگیڈ"

"ہاں فائر بریگیڈ - بازار والوں میں سے کسی نے خبر کر دی تھی، اب وہ آ رہا ہے"۔

اور جب کہانی والے بابا آئے تو ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"پردہ ختم ہو گیا۔ اب ہمیں سارا زمانہ دیکھ رہا ہے"۔

"لیکن عزیزو شاید اب وقت آ گیا ہے"۔

☆☆☆